سہ ماہی

کاروان ادب

جلد نمبر- ۲۵ | اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۸ء | شمارہ نمبر- ۳

مجلس مشاورت

● مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ● مولانا حافظ فضل الرحیم ● ڈاکٹر محمود الحسن عارف ● مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر مسئول

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

مدیر معاون ڈاکٹر تابش مہدی

مجلس ادارت

● مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ ● ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ ● ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی ● مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زر تعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

مشمولات

۱	پیغام :حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر رابطہ ادب اسلامی اس شمارے میں زیادہ تر مقالات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے بارے میں ہیں۔ فروری ۲۰۱۸ کو جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی، دینی اور ادبی خدمات پر سیمینار منعقد ہوا تھا اس شمارے کے مقالے وہ ہیں جو اس سیمینار میں پڑھے گیے تھے۔	۳
۲	اس شمارے کا اداریہ حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے متعلق ہے جس کا عنوان ہے ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''، اس اداریے میں مولانا کا ایک جامع تعارف کرایا گیا ہے۔	۵
۳	اس شمارے کا دوسرا مقالہ صدر رابطہ ادب اسلامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا ہے جو مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی و دینی اور اصلاحی خدمات پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل حضرت مولانا مدظلہ العالی کا خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے بھٹکل کے سیمینار میں پیش کیا۔ اس میں انھوں نے تفصیل سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ادبی، دعوتی و دینی اور اصلاحی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ مقالہ بہت اہم، وقیع اور جامع ہے۔	۸
۴	اس شمارے کا تیسرا مقالہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا ہے۔ انھوں نے اس مقالے میں مولانا علی میاں صاحب ندوی کی پوری انسانیت اور ملت کی فکرمندی کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور مولانا کے افکار کا احاطہ کیا ہے۔	۱۸
۵	اس شمارے کا چوتھا مقالہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کا ہے جس میں انھوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نئی نسل کے تحفظ ایمان کے لیے فکرمندی اور کوششوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور حضرت مولاناؒ کی تحریروں کے اقتباس سے اس پر بڑے خوب صورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مقالہ انتہائی مدلل، پُر مغز اور وقیع ہے۔	۲۷
۶	اس شمارے کا پانچواں مقالہ ''ہندستانی حکمرانوں سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی اصلاحی اور دعوتی مراسلت و ملاقاتیں'' اہم مقالہ ہے۔ مولانا علی میاں ندوی ان قائدین میں ہیں جنھوں نے کسی خلوت کدے میں اور گوشۂ مسجد میں زندگی نہیں گزاری۔ وہ ہمیشہ میدان میں رہے اور حکومت کے ذمہ داروں سے رابطے میں رہے اور انھوں نے ان کو نصیحت کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔	۳۷
۷	چھٹا مقالہ ''مفکرِ اسلام اور ہندستانی مسلمان'' ہے۔ یہ مقالہ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی کے قلم سے ہے۔ اس مقالے میں ان مسائل اور مشکلات کا بھی تذکرہ آگیا ہے جن سے ہندستانی مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔	۵۵
۸	ساتواں مقالہ مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''کاروانِ ایمان وعزیمت'' کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے اس کتاب کا تجزیہ پیش کیا ہے۔	۶۱
۹	اس شمارے کا آٹھواں مقالہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی خصوصیات کے متعلق ہے۔ مقالہ مولانا اقبال احمد ندوی کا ہے۔ یہ بھی بہت اچھا اور جامع مقالہ ہے۔	۶۶
۱۰	اس شمارے کا نواں مقالہ ''تحریکِ پیامِ انسانیت کی اہمیت اور ضرورت'' ہے۔ تحریکِ پیامِ انسانیت بہت اہم تحریک ہے اور حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حالات کے تقاضوں سے واقفیت کی دلیل ہے۔	۷۱
۱۱	اس شمارے کا دسواں مقالہ مفتی محمد سعید اسعد قاسمی صاحب کے قلم سے ہے اور عنوان ہے: برصغیر میں حضرت مولانا کا قائدانہ کردار۔	۷۸
۱۲	یہ شمارہ شعر و افسانہ سے خالی نہیں۔ دونوں اچھے معیار کے ہیں۔ ناظرین کی ضیافتِ ذوق کے لیے ایک افسانہ اور دو غزلیں پیش کی جارہی ہیں۔ آخر میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر ایک مرثیہ بھی ہے جو مولانا محمد نعمان اکرمی ندوی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔	۸۲ ۸۶

پیغام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ہمارا سہ ماہی کاروانِ ادب رابطہ ادبِ اسلامی کا سہ ماہی ترجمان ہے۔ رابطہ ادب اسلامی جو آج سے ۳۳-۳۴ سال پہلے باقاعدہ ادارے کے طور پر قائم ہوا' اس کی فکر اور اس کی ضرورت پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جوانی کے وقت سے کوشاں تھے اور اسی فکر کے مطابق انھوں نے تعلیمی نصاب اور عام مطالعے کے دائرے میں کتابیں بھی تصنیف کی تھیں اور جس کا عرب ادبا تک میں چرچا تھا' جنھوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے مل کر اس کو فروغ دینے کی تدابیر کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا اور اس کے لیے ندوۃ العلما میں دفتر قائم کیا اور پانچ سال بعد باقاعدہ رابطے کی تشکیل ہوئی۔ مولانا اس کے صدر منتخب ہوئے اور اس کے تحت سیمنار ہونے لگے اور منتخب مضامین اس ترجمان کاروان ادب میں شائع ہونے لگے۔ ہر سال سیمینار ہوتے تھے' اس کی روداد کاروان ادب میں آتی رہی اور اس تازہ شمارے میں بھی پیش کی گئی ہے۔

اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت دین و ادب دونوں لائنوں میں قدر و منزلت کی حامل بنی' ان کو تعلیم و مطالعے سے علوم دینیہ اور تاریخ و ادب میں شروع سے استفادے کا جو موقع ملا تھا اور گھر سے جو تربیت حاصل ہوئی تھی' اس سے ان کی شخصیت آفاقی بنی تھی۔ دین کے تقاضوں کی فکری و عملی صلاحیت بھی حاصل ہوئی اور تاریخ و ادب کا مطالعہ بھی بہت اچھا حاصل ہوا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا نے ان دونوں کو صرف نظری نہیں رکھا بلکہ عملی بنایا

اور دونوں لائنوں پر بڑا اثر ڈالا۔ اور ایک عظیم تعلیمی ادارے ندوۃ العلما کا ذمہ دار ہونے پر وہاں پر نئی نسل کے ذہن کو کارگر بنانے کا ان کو موقع ملا۔ اور اپنی اہم ترین فکر اسلامی کی حامل تصنیفات کے ذریعے ہند و بیرونِ ہند یعنی عرب اور اسلامی ممالک میں اپنی فکر کو پہونچایا اور اس میں انھوں نے زیادہ تر ان لوگوں تک بات پہنچائی اور ضرورت بتائی جو اپنے ماحول میں اپنے ملک میں ملت کے طالبانِ علم وادب کی رہنمائی کرتے تھے۔

مولانا کا طریقہ خالص ناقدانہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہمدردانہ اور ناصحانہ انداز کے لباس میں بات کو پیش کرتے تھے۔ اس کی بنا پر سامعین ان کی باتیں سنتے اور موافقت بھی کرتے تھے لیکن اپنے اس ہمدردانہ اسلوب میں وہ لائقِ توجہ بات کو بہت واضح طریقے سے پیش کردیتے تھے جس کو سننے والا ہمدردانہ انداز دیکھ کر برداشت کرلیتا اور فائدہ بھی اٹھاتا تھا۔ جو لوگ باقاعدہ دین واخلاق کی مخالفت عقائدی یا نظری انداز میں پیش کرتے، ان کے لیے حضرت مولانا کی تنقید واضح اور صریح ہوتی۔ اور جو لوگ عمل کی کمزوری اور حالات کی مجبوریوں سے غلط بات پیش کرتے، مولانا کی مخالفت ان کے لیے ان کی اچھی باتوں کی قدردانی کے ساتھ ہوتی۔ مولانا کا یہ اسلوب خاصی حد تک مقبول ہوا اور اس کا خاص حد تک اثر پڑا۔ اس سلسلے میں غالباً مولانا کے پیشِ نظر قرآن مجید کی یہ آیت تھی کہ ﴿ ادع إلى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتي هي أحسن ﴾ اس میں حکمت کے ساتھ حسن موعظت کے لفظ آئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مولانا کے اس اسلوب کو اور اس کے اندر جو متوازن اور جامع اسلامی فکر ہے، اس کو سمجھ کر اس کی روشنی میں کام کو انجام دیا جائے۔

اس تازہ شمارے میں مختلف اہلِ فکر اور اہلِ درد نے مولانا کے متعلق سیمینار میں اپنا اپنا مقالہ پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے ذریعے سے اس کو سمجھا جائے گا۔ حضرت مولانا کی شخصیت پر میری کتاب بھی ہے ''عہد ساز شخصیت'' کے نام سے 'مشاہدات و تجربات کی روشنی میں۔ اور اس شمارے میں میرا ایک مضمون بھی شامل ہے جو سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔ ☆☆☆

(اداریہ)

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اسلامی تاریخ میں علما کی کمی نہیں رہی۔ بیسویں صدی میں بھی آسمان کے روشن ستاروں کی طرح علما بے شمار ہوئے اور ان سے یہ زمین رشکِ کہکشاں بن گئی۔ کوئی عالمِ دین روحانیت اور ربانیت میں آفتاب و ماہتاب تھا' کوئی عالمِ دین تفسیری خدمات میں یا حدیث کی خدمات میں بلند مقام کا حامل تھا' کسی نے فقہ کے میدان میں بیش قیمت خدمات انجام دی تھیں' کسی نے تنہا سیرتِ نبوی کے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا مرتب کر ڈالی تھی' کسی نے اسلامی تاریخ مرتب کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا تھا' کسی نے اسلامی علوم کی کوئی شاخ اپنے لیے منتخب کی اور اسے شاداب اور بہار آشنا کیا' کسی نے جدید علمِ کلام کو اپنا موضوع بنایا اور اسلام پر اعتراضات کے مدلل اور تشفی بخش جواب دیئے اور مغرب کے سحرِ سامری کو توڑ ڈالا۔ ایسے علما بھی پیدا ہوئے جنھوں نے غیر ملکی اقتدار کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے میں جان و مال کی قربانیاں دیں۔ ایسے علما بھی سامنے آئے جنھوں نے اپنے اپنے ملکوں میں اسلام کے نظامِ حیات کو برسرِ عمل لانے کی کوشش کی۔ یہ تمام علما و صالحین قابلِ قدر اور لائقِ فخر ہیں اور امتِ اسلام کو ان سب کا شکرگذار ہونا چاہیے۔

مولانا علی میاںؒ کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے بہت سے علما کی گوناگوں خصوصیات کو اپنے اندر جمع کرلیا تھا۔ ان کی شخصیت عطرِ مجموعہ کی مانند بن گئی تھی۔ قرآن کا مطالعہ ان کا خصوصی میدان تھا۔ ان کی شخصیت قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اور سیرتِ نبوی کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ وہ مفکر بھی تھے' مؤرخ بھی تھے' ادیب بھی تھے اور عربی اور اردو کے بلند پایہ مصنف اور نثر نگار بھی تھے' مذہبی قائد بھی تھے' اتحادِ اسلامی کے داعی بھی تھے۔ اور اسی کے ساتھ ان کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ عالمِ اسلام کے محتسب اور نگراں بھی تھے۔ اقبال کی طرح ان کا بھی نظریہ تھا: ''ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات''۔ مسلم ملکوں میں کوئی کام خلافِ اسلام ہوتا' کوئی غلط گمراہ کن نظریہ پھیلایا جاتا' مولانا کی غیرت وحمیت اسے برداشت نہیں کرتی' مولانا اس موضوع پر لکھتے اور تقریریں کرتے۔ مولانا کی عربی زبان عام حالات میں گوہر بار ہوتی تھی لیکن

جہاں دین کو کوئی نقصان پہنچتا ہو' چاہے وہ عرب ملک ہی میں کیوں نہ ہو' تو پھر ان کا قلم تیغِ جوہر دار بن جاتا تھا۔

ترکی کے کمال اتاترک کا ذکر آئے یا مصر کے جمال عبد الناصر کا تذکرہ ہو' یا عراق کی بعث پارٹی کا' مولانا کے قلم کو شرر بار دیکھا گیا۔ مذکورہ دونوں شخصوں نے عالمِ اسلام کو جو نقصان پہنچایا ہے' مولانا اس سے شدید نالاں تھے اور دونوں سے متنفر اور بیزار تھے۔ مولانا اس وقت اگر بقیدِ حیات ہوتے تو ان کی غیرت کی زبان اور حمیت کے قلم کا رخ اور ان کی شرر بار تحریر و تقریر کا نشانہ وہ ملک بھی ہوتے جہاں علانیہ دین داری اور اسلام پسندی کو جرم قرار دیا جا رہا ہے' جب کہ وہاں عیاشی اور فحاشی کی پوری چھوٹ ہے' جو لوگ حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عرب دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ مذہبی ذہن رکھنے والوں کے لیے آشوبِ قیامت سے کم نہیں۔ بعض عرب ملکوں میں اخبارات کی رپورٹ کے مطابق حفظ قرآن اور مسجدوں میں دینی بات کرنا بھی جرم ہو گیا ہے اور اس کی سزا ۵۱ ہزار درہم مقرر ہے۔ (روزنامہ انقلاب ۱۷ر نومبر ۲۰۱۷) ۔ ہر جگہ دینی قیادت کو سخت سزا اور عقوبتوں کا سامنا ہے۔ یہ عصرِ حاضر کا سانحۂ کربلا ہے۔ آج بھی ان ملکوں میں اہلِ دین کے لیے وہی آبلہ پائی ہے' وہی دشت نوردی ہے۔

ہم یہاں دینی اداروں کے ذمہ داروں کو مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یاد دلانا چاہیں گے ۔ مولانا نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس دن سے پہلے ہمیں دنیا سے اٹھا لے جس دن ہم حکم رانوں کو اپنا رزاق سمجھنے لگیں گے'' :

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

مولانا علی میاں کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ پہلو شخصیت تھی ۔ وہ ہشت پہل ہیرے کی مانند تھے ۔ مولانا نے مصلحینِ امت اور صوفیائے کرام کا تذکرہ لکھا ہے' اس اعتبار سے وہ مؤرخ تھے ۔ وہ مدارس میں اصلاحِ نصاب اور مسلم ملکوں میں اصلاح اور اسلامی فکر و ذہن کے بڑے وکیل اور ترجمان تھے' اس اعتبار سے وہ مفکرِ اسلام تھے ۔ اسی کے ساتھ وہ ایک صوفی باصفا اور شیخِ طریقت بھی تھے اور روحانیت میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور اس کی گواہی اہلِ صدق و صفا نے دی ہے ۔ ایسی جامعیت کی شخصیت مشکل سے پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن مولانا کی شخصیت کی امتیازی صفت ان کی غیرت و حمیت ہے ۔ افسوس ہے کہ مولانا کا عرب و عجم میں احترام تو بہت کیا گیا لیکن اس کے باوجود علما نے اور دینی مدارس کے ذمہ داروں نے اور دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے ان کو اپنا رول ماڈل نہیں بنایا۔ بڑے بڑے علما ان کے دست گرفتہ ہوئے' اہلِ سلوک نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی' لیکن مولانا کے افکار و خیالات کو انھوں نے جذب نہیں کیا ۔ انھیں مولانا کے ذریعے مقاماتِ سلوک طے کرنے کی فکر لاحق رہی' لیکن ملتِ

اسلامیہ کے لیے مولانا کی بصیرت مندی اور دردمندی اور فکر کی ارجمندی اور مزاج کی غیرت مندی اور جذبے کی جرأت مندی کی انھوں نے بالکل اقتدا نہیں کی۔ مولانا خورشیدِ سحر کی طرح تھے' سب سے جدا سب کا رفیق۔ علما مولانا کا احترام بہت کرتے تھے لیکن مولانا کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے تھے۔ مولانا حکم رانوں کا احتساب کرتے تھے لیکن علما سیم وزر کا اکتساب کرتے تھے۔ مولانا کے یہاں دربار سے بے نیازی تھی' علما کے یہاں حضوری اور نیاز مندی تھی۔ یہ بڑا فرق ہے جو مولانا اور ان کے ہم عصر علما کے درمیان پایا جاتا ہے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ مولانا اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایک زاہدِ مرتاض اور ایک عابدِ شب زندہ دار شخص تھے' یا یہ کہ وہ ایک ادیب اور مصنف تھے' ان دونوں مزاج کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اپنے خلوت کدے سے باہر نہ آئے اور قرطاس وقلم کی بساط سجا کر یا تسبیح ومصلی کی دنیا میں خود کو مشغول رکھے لیکن ملک کے حالات کا تقاضا تھا کہ برادرانِ وطن کو خطاب کیا جائے۔ چنانچہ مولانا نے پورے ملک میں پیامِ انسانیت کی اصلاحی تحریک شروع کردی۔ یہ بھی مولانا کے لیے گویا اپنے علمی مشغلے کے تقاضے اور صوفیانہ مزاج وطبیعت کے خلاف ایک جہاد تھا اور پھر یہ بھی جہاد تھا کہ دنیا میں مسلمانوں میں ایمان کی حرارت پیدا کرنے کے لیے مولانا نے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے اور دشت ودریا سب عبور کر ڈالے اور ملکوں ملکوں کا سفر کیا' اور وہ بھی صحت کی خرابی اور علالت کے ساتھ۔ اپنی تمام معذوریوں کے باوجود اور صحت کی خرابی کے باوجود مولانا بہت فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے' گویا روحِ جہاد ان کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اپنی تمام علمی اور دینی مصروفیات اور عالمِ اسلام سے گہرے تعلقات کے باوجود مولانا عوام وخواص سب سے ملتے تھے۔ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے اور اخلاقِ نبوی سے متصف تھے۔ پورے عالمِ اسلام کی نگرانی اور نگہبانی کے ساتھ وہاں اہلِ دین کے ہاتھ میں سیاست کی زمام دیکھنے کی خواہش نے مولانا سے عربی میں طاقت ور کتابیں لکھوائیں' عرب لیڈروں سے ملاقاتیں کروائیں۔ مولانا کی سوز وگداز سے لبریز عربی اور اردو میں تحریریں ہیں جس میں مولانا نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کو ۱۹ برس گزر گیے لیکن اب بھی ان کی شخصیت عالمِ اسلام کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اسی لیے اس شمارے کے زیادہ تر مضامین حضرت مولانا کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ ان مضامین کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور ان کی روشنی میں کاموں کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بو الحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

☆☆☆☆☆☆

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دعوتی و دینی واصلاحی خدمات

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنے عہد میں عالمِ اسلام کی جامع کمالات کی حامل شخصیت تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل اور امتِ اسلامیہ کو درپیش خطرات کو اچھی طرح سمجھا تھا اور اُس کے لحاظ سے ملک وقوم کی اہم رہنمائی انجام دی تھی۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ تاریخ وادب اور علمِ حدیث میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو اُن سے علمی ذوق وراثتاً ملا تھا اور تعلیم اُس عہد کے ممتاز اساتذہ سے حاصل کی تھی اور دینی وفکری صلاحیت وجامعیت کے سلسلے میں اپنے بڑے بھائی مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ ، اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنیؒ اور استادعلامہ سید سلیمان ندویؒ جیسی ممتاز و صاحبِ فکروادب شخصیتوں کے تجربات اور علمی مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا تھا۔ علومِ دینیہ میں پختہ صلاحیتوں کے حصول میں شیخ الحدیث علامہ حیدرحسن خاں ٹونکیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا سید احمد علی لاہوریؒ سے گہرا استفادہ کیا تھا۔ علومِ عربیہ میں شیخ خلیل عرب یمانیؒ اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشیؒ سے فائدہ اٹھایا تھا۔

تعلیمی مرحلے کے بعد قرآنِ مجید اور حدیث شریف کی روشنی میں دعوتی کام کو اپنا موضوع بنایا۔ تاریخ کے موضوع میں بھی امتیاز پیدا کیا۔ اسلامی فکر کی تاریخ کے ساتھ مغربی مفکرین اور مغرب کی تمدنی وفکری تاریخ کا قابلِ اعتماد طریقے سے مطالعہ کیا۔ اسلام کے اولین عہد سے اُبھرنے والی علمی وفکری تحریکات اور اُن کی علمی تاریخ کو بھی گہری نظر سے دیکھا اور سمجھا۔ اسی کے ساتھ اپنے عہد میں اٹھنے والی دینی وملی تحریکات کو گہری نظر سے دیکھا اور عملی مشاورتی سطح پر ان کے ساتھ تعاون کیا۔ آزدائ ہند کے لیے کوشاں جماعتوں کو دیکھا جن میں جمعیت علماءِ ہند پیش پیش تھی، اُس کے بزرگ رہبروں کی فکروتوجہ کو سمجھا اور اظہارِ قدردانی محسوس کی اور جماعتِ اسلامی کے کام کو سمجھا اور اُس کی خصوصی افادیت کو سراہا۔ اور تبلیغی جماعت کے کام کو دیکھا اور اس کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ سے قریبی ربط رہا اور اُن کے مؤثر کام کی افادیت کو محسوس کیا اور شرکت کی۔ مولانا کو روحانی دائرے میں وقت کے ممتاز شیوخ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، ان کے شیخ خلیفہ غلام محمد دین

پوریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ، حضرت شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ، شام کے موقر بزرگ شیخ ہارون العسل الحجارؒ، شاہ محمد یعقوب مجددیؒ بھوپالی اور خاص طور پر مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے استفادے کا موقع ملا۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے اجازت وخلافت بھی حاصل ہوئی۔ اس طرح اُن کو جامع شخصیت بننے میں بڑی مدد ملی۔

حضرت مولانا کو طالب علمی اور تربیتی مدت میں سرپرستی ایسی شخصیتوں کی ملی جن کی سرپرستی سے مولانا کی ذہنی اور انسانی مزاج کی تشکیل بہت ضبط واعتدال کی صفت کی انجام پائی۔ ابتدائے عمر میں والدہ صاحبہ نے دینی اور اخلاقی پختگی اور عادلانہ مزاج بنانے کا اہتمام کیا اور نصیحتیں ایسے انداز کی کیں اور پابند کیا کہ مولانا کو اپنے دل چاہے مزاج کا بننے نہیں دیا، مثلاً مولانا کے خاندانی معاصرین اور قریبی اعزہ میں جدید علمی ومغربی مزاج کے مطابق علم وادب کو اختیار کرنے کا رجحان تھا، مولانا اِس رجحان کے اثر کو دیکھتے ہوئے انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے تو والدہ صاحبہ نے مولانا کی ایسی ذہن سازی کی کہ اِس رجحان پر دینی روح غالب ہوئی۔

والدہ صاحبہ کے علاوہ مولانا کے بھائی جو مولانا سے عمر میں بیس سال بڑے تھے اور علومِ دینیہ اور علومِ عصریہ کے جامع ہونے کے اثر سے فکرورجحان کے لحاظ سے جامعیت کے حامل اور دینی روح کے لحاظ سے اپنے مرحوم والد صاحب کے مثنی تھے، انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو والدِ مرحوم کے باحیات نہ رہنے کو محسوس نہیں ہونے دیا اور شفقت ومحبت کے ساتھ پورا کنٹرول کیا اور وقت کی عظیم دینی وعلمی شخصیتوں سے تعلق واستفادے کی طرف توجہ دلائی اور اس طرح مولانا کے لیے ایسا ماحول بنا دیا کہ مولانا میں ہمہ جہت خوبیاں پیدا ہوئیں اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں سے مولانا کو استفادے کا موقع ملا اور مولانا میں علمی وفکری لحاظ سے ترقی یافتہ اور اعتدال پسند صلاحیت پیدا ہوئی اور اپنے عہد کے معیاری حیثیت کے بڑوں سے استفادے کا مزاج بنا جو مولانا کی فکر وعمل میں تاحیات قائم رہا۔ مولانا اپنے عہد کی عظیم دینی شخصیتوں کے یہاں چھوٹے بن کر جاتے اور مستفید انداز سے ملتے اور ان کی خوبیوں سے اخذِ فیض کرتے اور اپنے فکر وخیال کو جامع سلجھے ہوئے اور پُراعتماد انداز سے پیش کرتے۔

مولانا کو اپنے والد اور خاندان کے بعض قریبی عزیزوں کی قربت سے جو ادب وتاریخ سے خصوصی اشتغال رکھتے تھے، ادب وتاریخ کا اچھا ذوق حاصل ہوا تھا، ادب میں اپنی زبان اردو کے علاوہ عربی زبان وادب میں خصوصی صلاحیت کے حامل بنے، اِسی کے ساتھ قرآن مجید کی بلاغت اور اُس کے مضامین کی قوت وتاثیر سے گہرا استفادہ کیا اور اِس میں اُن کو خصوصی صلاحیت حاصل ہوئی۔ تاریخی حالات کے دائرے میں انہوں نے ہندوستان اور بلادِ عربیہ کے علمی وسیاسی نشیب وفراز اور دینی وتمدنی عروج وزوال کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ مغربی ممالک کی سیاسی وتمدنی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا۔

مولانا کا تاریخِ اسلام کا مطالعہ صرف سادہ نہ تھا؛

بلکہ تاریخ کے واقعات کے فکری اور دعوتی پہلوؤں پر گہرا اور استفادے کے ذہن سے تھا، اُس کی اہم شخصیات کے تعمیری اور علمی پہلوؤں پر مخصوص نظر ڈالنے کے ساتھ تھا، اِسی لیے اُن کی خصوصیات کے مطابق اہم شخصیات کو اپنی تصنیفات میں پیش کیا اور صرف اُن کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ خود اپنے لیے اُن کی عملی سوغات حاصل کی، لہٰذا مولانا کی زندگی کی کارگزاریوں میں اُن کے اثرات واضح ملتے ہیں، مولانا کے تاریخی مطالعے میں فکرِ اسلامی کے اثرات ملتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کے فکری توسع کے بعض رجحانات مولانا کو پسند تھے جو اُن کے فکری مطالعے میں محسوس کیے جاسکتے ہیں اور تاریخِ اسلامی کے مجددین میں اپنے اپنے وقت کے فتنوں کے مقابلے کے لیے جو ذرائع مولانا نے دیکھے، اُن کا اثر لیا۔ مجدد الف ثانیؒ کے یہاں سے حکمرانوں کو مخلصانہ نصیحت اور حکیمانہ دعوت کو لیا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے یہاں سے علمی فکر مندی کو محسوس کیا اور فائدہ اٹھایا جو مولانا کی ''ارکان اربعہ'' میں محسوس کیا جاسکتا ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی کارگزاری سے مولانا نے خصوصی فائدہ اٹھایا جو اُن کی ''سیرت سید احمد شہید'' میں دیکھا جاسکتا ہے، اِن مختلف اور متعدد فائدوں کو مولانا کی خود علمی و دعوتی کاوشوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ امام غزالیؒ اور شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی فکر مندی اور کاوشوں کو محسوس کیا اور مولانا میں اس سلسلے میں احسان وسلوک اور ارشاد کا جذبہ ابھرا، اور اُنہوں نے اپنے زمانے کے مرشدین سے رابطہ قائم کیا اور فائدہ اٹھایا، خاص طور سے مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کا اثر زیادہ لیا، نیز اُن کا اعتماد حاصل کیا، مولانا میں اِس کا رجحان یوں بھی پیدا ہوا تھا کہ ان کے نانا اپنے عہد کے بڑے بزرگ تھے اور خاندان حسنیہ میں سید احمد شہید کے اثرات بھی تھے۔

تعلیمی موضوع پر مولانا کا مطالعہ یورپ کی ترقیات کا بھی تھا، انہوں نے تعلیم کا ترقی یافتہ انسان کی تشکیل میں گہرا اثر دیکھا، لہٰذا مولانا نے ندوۃ العلما کی تعلیمی فکر کو بہت پسند کیا اور پنی کاوشوں کو مخصوص طریقے سے اختیار کیا، چنانچہ ندوے نے اُن کی سرپرستی میں خصوصی ترقی کی اور اِس میں مختلف ضروری شعبے قائم ہوئے اور تعلیم کے مختلف پہلوؤں کا اضافہ ہوا۔

اِن تمام مذکورہ بالا اثرات سے مولانا کی عملی زندگی میں خصوصی رنگ پیدا ہوا جو اُن کے فکری، تعلیمی، دعوتی و باطنی خصوصیات میں واضح انداز سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے معاشرے میں وقتاً فوقتاً عروج وزوال کے جو حالات پیش آئے اور من حیث القوم جن شخصیات نے اصلاحِ حال کا جو کام انجام دیا اور جس نے معاشرے پر گہرا اثر ڈالا، مولانا نے اُس کا علمی جائزہ لیا اور اس سلسلے میں خاص طور پر حضرت مجدد الف ثانیؒ، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید کی اثر انگیزی اور کوششوں کے نتائج سے واقفیت حاصل کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اُن کی حسنِ کارکردگی اور مجددانہ سطح کو سمجھا اور فکری طور پر اُس سے بہت متاثر ہوئے، خاص طور پر بگڑے ہوئے اور خطرناک دور کے حالات میں مجدد الف ثانیؒ کی جو حکمت عملی تھی اُس کو بہت زیادہ کارگر محسوس کیا اور اپنے عہد کی مغربی یلغار اور الحادی اثرات

میں مجدد صاحبؒ کے طریقۂ عمل کو لائقِ ترجیح پایا اور اِسی کو دعوت کے لیے اور حکومتِ وقت کی اصلاح کے لیے موزوں سمجھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے اصلاح و تربیت اور جہاد کے سلسلے میں جو کارنامہ انجام دیا جو اُن کی عزیمت اور اتباعِ سنت کی مثال تھا اور عہدِ نبوت کے تدریجی طریقے کے تابع تھا، اِس میں مکی اور مدنی زندگی دونوں کی اتباع ملتی ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنے رفقا کی اصلاحِ باطن سے کام کا آغاز کیا، شدت وانتقام سے گریز کیا اور اپنے علاقے میں شیعیت کے اقتدار کو مضر سمجھتے تھے، لیکن اُس سے براہِ راست ٹکرانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اولاً دعوت و تربیت کے مرحلے کو انجام دیا اور اُس کے بہترین نتائج سامنے آئے، اُس کی روشنی میں سیرتِ نبوی کے اگلے مرحلوں کی پیروی کرتے ہوئے اولاً جہاد کے مرحلے تک پہنچے اور یہ جہاد بھی سیرتِ نبوی کی ممکنہ اتباع کے جذبے سے کیا، چنانچہ اِس کے لیے اپنے غیر اثر علاقے سے نکل کر آزاد اور مسلم علاقے میں جا کر مرکز بنایا اور وہاں سے عملِ جہاد کو کفار کے مقابلے میں اختیار کیا، مسلم اقتدار سے نبرد آزمائی میں احتیاط کی، اُن سے قبل کے عہد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کے ملحدانہ رویے کا مقابلہ حکیمانہ، تدریجی اور نجی انداز سے دعوت و اصلاح کے ذریعہ صبر و انتظار کے ساتھ کر چکے تھے۔

اِن دو مثالوں سے حضرت مولاناؒ نے اپنے دور کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے نمونہ حاصل کیا اور اصحابِ اقتدار سے ناصحانہ انداز سے بات کرنے اور متوجہ کرنے کو اختیار کیا اور خطابت کا موقع یا تحریری طریقہ اختیار کرنا پڑا تو مخاطبین میں اگر کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اُن کا تذکرہ مقدم کیا، پھر ناصحانہ انداز میں خرابیوں کی طرف متوجہ کیا، اِس طریقۂ کار کا یہ اثر ہوا کہ اُن کی مخاطبت کو ناصحانہ انداز کی ہونے کے سبب معاندانہ یا مخالفانہ نہیں سمجھا گیا؛ بلکہ نصیحت کو دوستانہ سمجھتے ہوئے سنا گیا اور فائدے سے خالی نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں مولانا کا طریقہ یہ رہا کہ اصحابِ اقتدار کی پالیسی کا جائزہ لے کر اُس کی کمزوریوں اور مضرتوں سے اصحابِ اقتدار کو آگاہ کرنے کے لیے سربراہانِ اقتدار سے ملاقات کر کے واقف کراتے اور یہ ایسے اسلوب وزبان کے ذریعے کہ وہ اِس توجہ دہانی کو مخلصانہ سمجھتے اور اِس طرح اُن کی بات ناصحانہ سمجھی جانے پر اثر رکھتی۔ دینی و ملی جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ بھی مولانا کا اِسی طرح کا معاملہ تھا، مولانا اُن کے اچھے کاموں کی قدردانی کرتے اور حسبِ موقع اُن میں عملی شرکت کرتے اور جہاں مشورہ دینے کی ضرورت سمجھتے مشورہ بھی دیتے؛ لیکن اُس کا انداز مخالفانہ نہ ہوتا؛ بلکہ ناصحانہ ہوتا، جماعتِ اسلامی کے ساتھ، تبلیغی جماعت کے ساتھ، نیز اہم دینی و ملی جماعتوں کے ذمہ داروں کو بھی اُن کی پوری قدردانی کے ساتھ حسبِ ضرورت مخلصانہ مشورہ دیتے، مولانا کی نظر میں دعوتی کام ملت کا زیادہ اہم کام تھا، وہ دعوتی کام کے ساتھ سیاست کے مروجہ طریقۂ کار کو خلط ملط کرنے کو مضر سمجھتے تھے اور اختلافی امور میں غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرتے، چنانچہ انھوں نے جن جماعتوں میں شرکت کی وہ سب متحدہ نوعیت کی تھیں، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا ساتھ دیا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں ذمہ داری کی سطح پر شریک

رہے، ندوۃ العلما کو بھی اختلافی معاملات سے غیر جانب دار رکھا، اپنی اس مذکورہ احتیاط کے ساتھ نصیحت وتوجہ دہانی بھی مثبت طریقے سے کرتے تھے، مصر میں اخوان المسلمین کے قائدین سے ملاقات پر اُن کے اچھے پروگراموں اور کاموں کی قدردانی کرتے ہوئے اُن کو اُن کی دعوتی کاوشوں کو دعوتی دائرے کے ساتھ مخصوص رکھنے کا مشورہ دیا جس کو جماعت کے قائدین نے سراہا، لیکن وہاں کے حالات نے اُن کے قائدین کو زیادہ دن تک اُس پر نہیں رہنے دیا، مولانا کا خیال تھا کہ دعوت اور طریقۂ سیاست عموماً دونوں کا عمل علاحدہ علاحدہ ہونا مناسب ہے، مولانا سیاست کی پوری سمجھ رکھتے تھے اور نجی سطح پر اُس کے بارے میں رائے بھی دیتے تھے، لیکن عملی انداز میں سیاست میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے اور اِس کو دعوتی مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں سمجھتے تھے، مولانا دعوتی کوششوں کے ضمن میں مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرہ اور مخلوط معاشرے میں پیامِ انسانیت کے عنوان سے اصلاحی کوششوں کو اپنانے کی تلقین کرتے تھے اور اُس میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کی امتیازی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ شخصی دائرے میں وہ متواضع، کسرِ نفسی کی خصوصیت، دینی حمیت اور صلاح وتقوی کے حامل تھے۔ اجتماعی دائرے میں با اخلاق اور دوسروں کی امتیازی خصوصیت کو تسلیم کرنے والے اور اُن کی رائے کو اُس کا حق دینے والے تھے۔ اِسی کے ساتھ ملت کے معاملات کو اُن کے پس منظر میں رکھ کر رائے قائم کرنے والے اور ممالکِ اسلامیہ میں قائم نظاموں اور وہاں جو انقلاب آئے، اُن انقلابوں کے پسِ پشت جو عوامل واسباب انقلاب کرنے والوں کے تھے، اُس کے اصل مقاصد کی حقیقت تک پہونچنے کی خصوصیت کے حامل تھے۔ چنانچہ مصر میں انقلاب کرنے والے اشخاص کو اور پھر لیبیا، عراق، شام اور ایران میں ہونے والے انقلابوں کی صحیح صورتحال کا اندازہ حضرت مولاناؒ نے شروع ہی میں کرلیا تھا، شروع میں مولاناؒ کے اندازے کو لوگوں نے قابلِ قبول نہیں سمجھا تھا، لیکن بعد میں اُن کے اندازے کی پوری طرح تصدیق ہوئی اور اُس پورے علاقے میں جہاں جہاں دینی نعرے کے ساتھ انقلابی کوشش ہوئی یا تو ناکام ہوئی، یا شروع میں اچھے وعدے، بعد میں اُس کے برعکس صورتِ حال سامنے آئی، دراصل اکثر حکمراں باہری طاقتوں کے تحت اپنی پالیسی بناتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ پر دعوت کے کام کو اہمیت دینے کا بڑا غلبہ تھا۔ اس سلسلے میں اُن کا انداز حکیمانہ ہوتا تھا، جو اُنہوں نے قرآن مجید کی رہنمائی سے حاصل کیا تھا، وہ ذمہ دارانِ حکومت سے ملتے اور بلند سطح سے ملتے، اُس میں مرعوبیت کا اثر نہیں ہوتا تھا، وہ دولت مندوں اور حکمرانوں سے مادّی مدد لینے یا شخصی فائدہ اٹھانے سے پورا گریز کرتے تھے، اُن سے ہدیہ لینے سے بھی معذرت کرتے تھے، اُن کا کہنا تھا کہ ہم شخصی فائدہ اٹھائیں گے تو اُن کو غلطیوں پر ٹوکنے کا اثر باقی نہیں رہے گا، مولاناؒ کے اِس استغنائی عمل سے اُن کا وقار بااثر شخصیات کے دلوں پر قائم ہوتا تھا کہ یہ بے غرض عالمِ دین ہیں اور یہ خیر خواہی کی صفت کے حامل ہیں۔

خود میرا اُن کا ساتھ کئی اہم سفروں میں رہا، میں نے اُن کو بعض بادشاہوں سے بات کرتے دیکھا اور کڑوی نصیحت

خوبصورت غلاف میں پیش کرتے پایا، بعض وزرائے اعظم کو نصیحت کرتے دیکھا کہ تلخ بات پر بھی اُن کے مخاطب کو ہاں اور جی ہاں کہتے دیکھا، اور بعض رہنماؤں سے بات کرتے ہوئے میں نے یہ طرز دیکھا کہ خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ کڑوی نصیحت بھی سنادی گئی جس کو مخاطبین نے برداشت کیا، ایسی متعدد مثالیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، مولانا کے اِس طرز کا میں نے بڑا فائدہ اور خاصا اثر دیکھا۔

میں نے مولانا کو شاہ فیصل شہیدؒ سے بھی بات کرتے دیکھا، شاہ فہدؒ سے بھی بات کرتے دیکھا اور شاہِ مراکشؒ سے بھی مخاطب ہوکر بات کرتے دیکھا اور ہندوستان کے کئی وزرائے اعظموں سے بات کرتے دیکھا، خوشامد سے خالی، لیکن خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ توجہ دہانی، مؤثر اور ناصحانہ انداز میں بات کرتے دیکھا، شاہ بانو نان نفقہ کیس میں جو کامیابی ملی، اُس میں مولانا کی اِس حکمت عملی کا بھی دخل رہا، بابری مسجد کے سلسلے میں راجیو گاندھی کو مسئلے کے حل کے لیے بروقت متوجہ کرکے مسجد کو محفوظ رکھنے پر زور ڈالتے دیکھا، ملی معاملات میں تنہا فیصلہ کرنے کے بجائے ملک کی مقتدر سیاسی شخصیات اور مذہبی رہنماؤں سے رابطہ قائم رکھتے اور اپنے کسی موقف پر اڑنے کے بجائے مشاورتی طریقے کو ترجیح دیتے اور اپنے رفقا کی رائے کو فیصلہ لینے میں پورا اختیار دیتے تھے۔

گفتگو اور تقریر میں مولانا کی بات اثر انداز اسلوب میں ہوتی تھی جس کے ذریعے وہ مفید اور توجہ دہانی کا کام لیتے تھے، عربی زبان بھی نہایت فصاحت سے استعمال کرتے تھے، بات کو نہایت سلیقے سے پیش کرتے تھے، مولانا کا تصنیفی کام بھی نہایت مؤثر تھا۔ اُن کی کتابوں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، پڑھنے والوں نے اُن کو بہت سراہا اور اُن میں مولانا کے مدلل اسلوب اور دعوتی انداز کو بہت پسند کیا اور اِس سلسلے میں ابھی کم عمری ہی تھی جب برصغیر کی دعوت وعملِ جہاد کی عظیم القدر تحریک کو مؤثر انداز میں اپنی علمی تصنیف ''سیرت سید احمد شہید'' کی صورت میں پیش کی جس کو برِصغیر کے اہلِ علم نے بہت قدر واثر سے دیکھا اور مولانا کی اِس کاوش کو بہت سراہا۔ اُس کے بعد مولانا نے ایک بہت اہم کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) بلیغ عربی میں پیش کی، یہ بہت مقبول ہوئی اور پورے عالمِ اسلام میں پڑھے لکھے طبقوں میں بہت قدر کے ساتھ پڑھی گئی اور اُس کی اہمیت کا تذکرہ پڑھنے والوں کی زبان سے سنا گیا، اِس میں اسلام اور مسلمانوں کے ظہور وعروج، پھر زوال وانحطاط کا مدلل جائزہ پیش کیا گیا، اِس کے ساتھ مولانا کی دیگر اہم کتابوں میں ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' نامی کتاب سامنے آئی جس نے اسلامی تاریخ کے مجددانہ کارناموں کی تاریخ پیش کردی، اُس کو پڑھ کر دین وملت کے داعیوں کو مفید مواد حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح موجودہ مسلمان حکومتوں پر مغربیت کے جو مضر اثرات ہیں، اُس کا جائزہ مدلل طریقے سے پیش کیا، جو ''مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' نامی کتاب میں ہے، اِس کے علاوہ مولاناؒ کی تقریروں کے مجموعے اور اُن کے اصلاحی خطبات بہت اثر رکھتے ہیں اور اُن کی متعدد علمی سطح کی کتابوں نے مقبولیت حاصل کی، مولاناؒ کی عربی تقریر بھی بہت مؤثر ہوتی تھی، بالکل اہلِ عرب کی طرح

تقریر کرتے، جس کا اقرار عرب علما نے بھی کیا۔

مولانا کا یہ مزاج اپنے عہد کی شخصیتوں میں بہت کارگر اور مفید اثر ڈالتا تھا اور اِس طرزِ عمل نے مولانا کو اپنے عہد میں منفرد شخصیت کا حامل بنا دیا تھا، اِس کے ذریعے انہوں نے اپنے عہد کے بادشاہوں اور حکومتی سربراہوں سے اصلاح و درستی کی ضرورت کی طرف بہت پُر اعتماد اور خیر خواہانہ انداز سے گفتگو اور نصیحت کا طریقہ اختیار کیا اور اُن سے مادی فائدہ اٹھانے سے پورا پرہیز کیا، تاکہ استغنا کے ساتھ بات میں جو اثر ہوتا ہے، وہ اثر پڑے۔ اور اِسی کا نتیجہ یہ رہا کہ مولانا کی نصیحتوں کو خیر خواہانہ انداز کا سمجھ کر اُس عہد کے حکمرانوں نے اِن نصیحتوں کو قدر کے جذبے سے سنا اور کچھ نہ کچھ اثر لیا۔ حضرت مولانؒا کی ناصحانہ گفتگو کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ایک جمہوری، آزاد و ترقی یافتہ ملک میں اچھا یا برا کردار ملت کی حفاظت یا ملت کی ہلاکت کا پارٹ ''خواص'' کا وہ طبقہ ادا کرتا ہے جو مجالسِ قانون ساز، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اُس ملت کا نمائندہ یا حکومت وانتظامیہ میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز ہوتا ہے، یا صحافت و سیاست میں اونچا مقام رکھتا ہے، یا ملک کے دانشوروں، اہلِ قلم اور مفکرین میں اُن کا شمار ہوتا ہے، اُسی طبقے کا ایک ایک فرد ہزاروں، لاکھوں کے مقابلے میں زیادہ وزن واعتبار رکھتا ہے۔

اِس طبقے کی دینی حمیت و ملی غیرت، اخلاقی جرأت، غیر معمولی قربانیاں، صدیوں کے لیے ملت کا مستقبل محفوظ کر دیتی ہیں اور جو کام بعض اوقات لاکھوں کروڑوں انسان انجام نہیں دے سکتے، وہ یہ مٹھی بھر جماعت انجام دے دیتی ہے، وہ اگر کسی ملی مسئلے پر یک زبان و یک آواز ہو جائے اور ملت کے دین، اُس کی تہذیب یا اُس کی ثقافت اور کلچر یا اُس کے قانون و شریعت کو بچانے، یا ملت کو باعزت، بااصول رکھنے کے لیے اپنے ذاتی مفاد کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اقتدار کی کرسی اور جاہ و اعزاز سے دستبردار ہو جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، ایوان ہائے قانون ساز کی رکنیت، صدارتیں اور قیادتیں، عہدے اور اس مقصدِ عزیز کے سامنے پرِ کاہ کے برابر بھی نہ معلوم ہو، تو چشم زدن میں بڑے بڑے فیصلے بدل جائیں، ناممکن ممکن ہو جائے، خطرے کے پہاڑ اور چٹانیں ریت کے ذرات میں تبدیل ہو جائیں اور پوری ملت، عزت و توقیر، شرف و اعتبار سے ہمکنار ہو۔

لیکن اگر معاملہ اِس کے برعکس ہوتا ہے، اُن کو ملت کے اجتماعی مفاد کے مقابلے

میں اپنی کرسی عزیز ہوتی ہے اور اپنا مفاد مقدم، اُن کو ادنی سے ادنی خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں ہوتی، یا حکومت و اکثریت کی پیشانی پر ادنی سی شکن پڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، وہ اپنے حقیر فائدے کے لیے ملت کے بڑے سے بڑے نقصان، اُس کی تہذیب کا زوال اور اُس کے ذہنی و دینی ارتداد تک گوارا کر لیتے ہیں اور ملت کے تمام مفادات، اُس کی موت وحیات کے مسئلے سے آنکھیں بند کر کے اپنے منصوبوں کی تکمیل، اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنے محلوں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں اور کوئی بڑے سے بڑا واقعہ یا حوادث کا تازیانہ، اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی نہیں ہوتا، تو پھر اُس ملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے اور اُس کے بڑے سے بڑے مخلص وناصح اور چارہ گر ومسیحا اُس کے درد کی دوا نہیں کر سکتے"۔

(خطبات علی میاں، مرتبہ: مولانا محمد رمضان میاں صاحب، کراچی، جلد پنجم، ص: ۲۳۰، فرید بکڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ)

حضرت مولانا اپنے اس طریقہ وطرزِ عمل کو زیادہ مفید سمجھتے تھے اور اُن کو اِس کے سلسلے میں اچھے تجربات ہوئے کہ اُن کی باتوں اور توجہ دہانیوں کو بڑی سے بڑی شخصیت نے توجہ سے سنا اور اظہار قدر دانی کیا اور اِس کی بنا پر عمل پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا تھا، یہ طرز قرآنی ہدایت کے مطابق بھی ہے کہ ﴿ادْعُ إِلِى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ (سورہ نحل: ۱۲۲) اس آیت میں مخاطب سے ناصحانہ اور اچھے انداز سے بات کرنے کا حکم ہے۔ اور ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ تم اچھے انداز میں بات کروگے تو تمہارا دشمن تمہارا دوست بن سکتا ہے اور تجربہ بھی بتاتا ہے کہ مشورہ اور نصیحت میں سخت کلامی سے معاملہ مزید خراب ہو جاتا ہے اور جس کی لاٹھی زیادہ بڑی ہوتی ہے، وہ کامیاب ہوتا اور انتقام لیتا ہے۔ اور افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلطی عموماً کی جاتی رہی ہے اور اِس کے نتائج سنگین آتے رہے ہیں۔ مولانا نے اِس غلطی کے نقصان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں:۔

"مسلمانوں کی ایک عام کمزوری ضرورت سے زیادہ جذباتیت ہے، یہ کمزوری جہاں اور جب اجتماعی طور پر پائی جاتی ہے اور جماعتی یا علاقائی مزاج بن جاتی ہے، بڑے خطرات اور نقصانات کا موجب ہوتی ہے اور اِس سے بعض غلط اندیش عناصر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، بعض نادان دوست بھی سخت نقصان پہنچا دیتے ہیں، تاریخ میں بڑے ملی حوادث ومصائب کا سبب یہی جذباتیت، اشتعال

پذیری اور سرعتِ انفعال تھی، کسی شاعر نے صحیح کہا ہے:۔

چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را عزتے ماند نہ مہ را

پھر اگر یہ ''بے دانشی'' ایک دو افراد کی طرف سے نہ ہو؛ بلکہ ایک بڑی جماعت یا عوام کی طرف سے ہو، تو وہ اور مہیب ورسوا کن اور دورس نتائج کا سبب بن جاتی ہے۔ اِسی حقیقت کو مشہور حکیم عرب شاعر متنبّی نے اپنے اِس شعر میں بیان کیا ہے:

وجرمٍ جرّہ سفہاء قومٍ
فحل بغیر جارمہ العقابُ

(وہ غلطی جس کا ارتکاب کسی قوم کے خفیف العقل لوگوں نے کیا، اُس کے نتیجے میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے اور نا کردہ گناہ لوگوں کو بھی اُس کی سزا بھگتنی پڑی)۔

جن قوموں یا جماعتوں نے دنیا میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں یا تاریخ میں سلطنتوں اور تہذیبوں کی بانی قرار پائی ہیں، اُنہوں نے دینِ حق کا دنیا میں جھنڈا بلند کیا ہے، وہ طبعی طور پر حلیم و بردبار، متحمل وعالی ظرف اور اِسی کے ساتھ بہادر وغیور واقع ہوئی تھیں اور صدرِ اول کے مسلمان تو اِس کا بہترین نمونہ ہیں،

''Highly inflammable''

(جلد اور بہت زیادہ آگ پکڑنے والی چیز)

یہ پٹرول کی تعریف ہوسکتی ہے، بارود کی تعریف ہوسکتی ہے، کسی آتشگیر مادے کی ہوسکتی ہے، مسلمان کی تعریف نہیں کہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھے اور عواقب ونتائج سے بے پرواہ ہوکر جو چاہیں کر گزریں، عمل ورد عمل میں کوئی تناسب نہ ہو، رائی کا پربت بنادیں اور دوست دشمن، خطاوار وغیر خطاوار، کمزور وطاقتور، بچوں بوڑھوں کی کسی کی تمیز نہ ہو، یہ جذباتیت اور سریع الانفعالی ایک خطرناک بیماری ہے جس کے علاج کی فوری ضرورت ہے اور ہمارے قائدین اور داعیان دین اور تعلیم وتربیت واصلاح وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو اِس کی طرف فوراً توجہ کرنا چاہئے''۔

(خطابت علی میاں، جلد پنجم، صفحہ: ۲۱۰)

حضرت مولانا کا یہ تبصرہ سرسری انداز کا تبصرہ نہیں تھا؛ بلکہ تاریخ کے مطالعے سے وہ اس رائے پر پہنچے تھے، اور وہ اِس سلسلے میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے طریقۂ کار کی مثال دیتے تھے اور خود اُنہوں نے اپنے عمل کے لیے مثال بنایا کہ اسلام اور مسلمانوں کے عزت وذلت کے مسائل میں بہت

مضبوط اور دل وجان سے لگ جانے والے تاثر وکوشش کو اختیار کرتے ہوئے حکمت وحسن تدبیر کو اپنایا، اُن کی فکرمندی وشدتِ تاثر کو دیکھتے ہوئے اُن کے متعلق پر جوش طریقے کو اختیار کرنے کی رائے متعدد لوگوں کی ہوئی، لیکن اُن کے متعلق یہ رائے صحیح نہیں، اُن کا عمل اُن کے طریقۂ کار میں حکمت وحسن تدبیر کا ہی ملتا ہے، اُن کی کئی سربراہانِ مملکت سے ملاقاتوں میں جن میں میں موجود رہا، میں نے یہی دیکھا کہ ان کی حکومت وسیاست کی خامیوں کا بہت صحیح اندازہ کرکے اُن سے ملاقات پر واضح طریقے سے اُن کو متوجہ کیا؛ لیکن بات کرنے کا انداز حکمت وحسنِ کلام کا رہا، اُن کی صحیح باتوں کا اعتراف وتحسین کرتے ہوئے قابلِ مذمت معاملوں کو واضح طریقے سے قابلِ تبدیل قرار دیا، چنانچہ اُن کی گفتگو سے اُن کو ناراضی نہیں ہوئی؛ بلکہ اُنہوں نے اپنے عمل کی توجیہ ووضاحت کو اختیار کیا، اور میں نے دیکھا ہے کہ مولانا نے صراحت سے اُن کے نقائص کی بات کی، لیکن ایسے انداز میں کی کہ اُن کو مولانا کی بات میں خیر خواہی کا جذبہ محسوس ہوا، اِسی کے ساتھ مولانا کا یہ عمل بھی رہا کہ اُن لوگوں کے نقص کو نجی طریقے سے کہنے کو ترجیح دیتے، اخبارات میں اُس کو پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بناتے تھے اور کھلے عام اُن پر تنقید کے سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ اِس کا فائدہ ہوتا تھا اور شاہ بانو کے معاملے میں وزیر اعظم کا پارلیمنٹ سے قانون منظور کرانا اِسی طریقے کا فائدہ تھا۔ اٹل بہاری باجپئی کے وزیر اعظم ہونے کے زمانے میں باجپئی مولانا سے ملے اور مولانا نے اُن کو اِسی انداز میں نصیحت کی اور اُس کا فائدہ بھی ہوا کہ بی جے پی کے نمائندہ ہونے کے باوجود نیم سیکولر انداز کے وزیر اعظم رہے۔

بابری مسجد کے سلسلے میں مولانا کی کوششوں سے ہندو مذہبی رہنما نے مسجد کو بحال کرنے کی ایک تدبیر کا وعدہ کیا، لیکن اس سلسلے کے دیگر رفقاءِ کار نے اُس کو ناکافی قرار دے کر قابلِ قبول نہیں قرار دیا، بعد میں حکومت نے مسجد کو آثارِ قدیمہ میں لینے کا منصوبہ جاری کیا، اُس کو بھی رفقائے مسئلہ نے کافی قرار نہیں دیا، اس طرح مسئلہ وہاں تک پہنچا کہ دشواری بڑھی۔

مولانا سربراہانِ حکومت سے نرم وناصحانہ انداز اختیار کرنے کے ساتھ اِس بات کا بھی اہتمام رکھتے تھے کہ اُن سے کسی طرح کا مالی یا دنیاوی فائدہ نہیں اٹھاتے، اُن کے جائز ہدیے بھی قبول نہیں کرتے، سعودی عرب کی دو اہم کمیٹیوں کے ممبر تھے اور ممبروں کو شرکت پر کرایے کے علاوہ الاؤنس بھی ملتا تھا، مولانا کرایے تک پر اکتفا کرتے، الاؤنس نہیں لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اس طرح کا کوئی فائدہ اٹھائینگے تو کڑوی بات اُن سے نہ کہہ سکیں گے حتی کہ ندوے کے ناظم ہونے کی ذمہ داری کے تقاضے سے ندوے کی مالی اعانت کی اپیل بھی نہیں کرتے تھے، یہ کام اُن کے معاونین کے ذریعے انجام دیا جاتا رہا۔

مولانا کی شخصیت آج بھی قابلِ نمونہ ہے، اور جن خطرات کی نشاندہی مولانا نے کی تھی، وہ مزید ابھر کر سامنے آگئے ہیں، اُن کے دعوتی و اصلاحی طریقۂ کار کو اختیار کرنا موجودہ حالات میں بہت سودمند ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
پوری انسانیت اور ملت کی فکرمندی

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پوری انسانیت کی فکر مندی:

عالمِ عربی کے ایک دانشور نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی نمایاں خصوصیت ملتِ اسلامیہ کی فکرمندی بتائی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملت کی فکرمندی کے ساتھ حضرت مولاناؒ پوری انسانیت کے لیے فکرمند تھے، اسی لیے دنیا میں کہیں بھی اور کسی بھی طبقۂ انسانی کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آجاتا تو مولانا تڑپ اٹھتے اور بے چین ہوجاتے تھے، یہ ان کی بنیادی صفت تھی، مولاناؒ نے اپنی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں شیخ نظام الدین اولیاؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ''لوگ آکر ہم سے اپنا دکھ درد بیان کرتے ہیں اور وہ درد میرے دل میں منتقل ہوجاتا ہے''۔ یہ صفت خود مولاناؒ کی تھی، دنیائے انسانیت کی فکرمندی آپ کو بے چین کیے رہتی، دنیا کے حالات پر نظر رکھتے، خطرات کی نشاندہی کرتے، امراض کی تشخیص کرتے، مسائل کا حل پیش کرتے، دنیا کے کسی بھی حصے میں پیش آنے والے واقعات، حوادث، آفات اور سانحوں پر تڑپ اٹھتے اور آواز بلند کرتے، انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتے، راتوں میں تڑپتے اور بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے، شدتِ تاثر سے کہتے تھے کہ کوئی اچھی خبر سناؤ، چاہے بعد میں اس کی تردید کردینا، مولانا کی تحریروں اور تقریروں سے یہ فکرمندی اور بے چینی صاف جھلکتی ہے اور جو بھی مولانا کی تصنیفات، خطبات اور مقالات کا مطالعہ کرتا ہے، وہ اس خصوصیت کو صاف طور پر محسوس کرتا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے، حضرت مولاناؒ ایک تقریر میں کہتے ہیں۔

''اِس وقت دنیا کے اندر جو انقلاب آیا ہوا ہے، اُس کو خواہ کسی عنوان سے بیان کیا جائے، وہ یہ ہے کہ انسان کا رخ خیر سے شر کی طرف مڑ گیا ہے، ساری طاقتیں ہیں، لیکن اس کی منزل غلط ہوگئی ہے، وہ چل رہا ہے، چلنا ہرگز بند نہیں ہوا، بلکہ پہلے چلتا تھا، پھر دوڑنے لگا اور اب اڑنے لگا ہے، لیکن جس طرف اڑ رہا ہے، وہ شر کی منزل ہے، انسانیت کُشی کی منزل ہے، انسان کو برباد کرنے کی منزل ہے۔

سب نے جاہ طلبی میں، اقتدار پسندی میں،

حکومت کی کرسی حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا ہے، انسانیت کا سارا اثاثہ داؤں پر لگا رکھا ہے، انسانیت کی ساری متاع داؤں پر لگا رکھی ہے، ساری تاریخ داؤں پر لگا رکھی ہے، ساری تہذیب داؤں پر لگا رکھی ہے، بلکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انسانیت کی لاشوں پر اگر انسان کھڑا ہو کر "**أنا ربكم الأعلى**" کہہ سکتا ہے تو درجنوں کی تعداد میں نہیں، سیکڑوں کی تعداد میں نہیں، ہزاروں انسان اس کے لیے تیار ہیں، ان اللہ کے بندوں سے، عقل کے دشمنوں سے پوچھا جائے کہ جب انسان ہی نہ ہوں گے تو تم کس پر حکومت کروگے، پتھروں پر حکومت کروگے، پہاڑوں اور ٹیلوں پر حکومت کروگے، ریت کے ذروں پر حکومت کروگے، لیکن آج کے انسان کو اِن سوالات سے کوئی دلچسپی نہیں، اب تو صرف حکومت مقصود بن گئی ہے اور دماغوں پر ایسی مستولی ہوگئی ہے کہ محکوم کی بھی فکر نہیں، اقتدار کی یہ ہوس جس کے لیے فرعون قرآن میں معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور دولت کی ہوس جس کے لیے قارون معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، وزارت کا شوق جس کے لیے ہامان معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تین زندہ جاوید کردار ہیں، فرعون، ہامان، قارون اِن سب کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، فرق یہ ہے کہ فرعون کے پاس ساز وسامان تھا اور ہم میں سے کتنے آدمی ہیں جن کے اندر فرعون بول رہا ہے، لیکن اُن کے پاس اپنے مقاصد پورا کرنے کے لیے ساز وسامان نہیں، آج ساری دنیا اِس راستے کے پیچھے آنکھ بند کر کے چل رہی ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ انسان خربوزوں اور تربوز کی طرح منڈی میں بک رہے ہیں، پارٹیاں بدلی جارہی ہیں، عقیدے بدلے جارہے ہیں، زندگی بھر کے کردار پر، زندگی بھر کی تاریخ پر پانی پھیرا جارہا ہے، آدمی ایک کیمپ سے نکل کر دوسرے کیمپ میں جانے کے لیے تیار ہے، جس سے ساری عمر دوستی رہی اس سے دوستی ختم کر کے اُن سے دوستی کرنے کے لیے تیار ہے جن سے ساری عمر دشمنی رہی ہے، جن کو ساری عمر برا کہتے تھے، ان کو اچھا کہنے کے لیے تیار، جن کو پاؤں تلے روندتا تھا ان کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار، جن کو آنکھوں میں جگہ دیتا تھا ان کو پاؤں تلے روندنے اور مسلنے کے لیے تیار، سب کچھ انسان کرنے کے لیے تیار ہے اور جس سے آپ پوچھیں گے، وہ اگر صحیح بات کہنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہو، منافق نہ ہو، تو آپ سنیں گے سب کے دل میں وہی فرعون بیٹھا ہوا ہے اور دنیا کے فساد کا باعث یہی ہے"۔ (مغرب سے صاف صاف باتیں، ص:۷۵-۷۷)

میدانِ عمل کی وسعت اور جامعیت

حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی ملتِ اسلامیہ، عالم اسلام بلکہ پوری انسانیت کی فکرمندی سے عبارت ہے، حضرت مولانا نے عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا، ، مغربی فکر اور یورپی تہذیب کا غلبہ دیکھا، قومیت، وطنیت، علاقائیت اور لسانی و

تہذیبی عصبیت کا دور دیکھا، مسلمانوں کی کمزوری و پسماندگی، مغرب سے ان کی مرعوبیت اور علم وفن کے میدان میں ان کے جمود اور تعطل کو دیکھا، متعدد اسلامی تحریکوں کی سرگرمیاں دیکھیں، بلکہ بعض تحریکوں میں عملی شرکت بھی کی اور ان کا تجربہ کیا، اپنے عہد کے قائدین اور دانشوروں سے رابطہ رکھا اور اپنے بیرونی سفروں میں تعلیمی وتربیتی مراکز کو قریب سے دیکھا، نئے تعلیمی نظریات ورجحانات اور جدید تمدنی وتہذیبی افکار وخیالات کا انہوں نے باریک بینی سے مطالعہ کیا اور ان کے نتائج واثرات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔

مغربی تہذیب کے متعلق حضرت مولانا کا موقف

حضرت مولانا نے جس زمانے میں ''اسلام کی طرف لوٹئے'' کی صدا لگائی ،وہ غیر اسلامی افکار ونظریات خصوصا مغربی فکر کے غلبے کا زمانہ تھا، اسلام مغرب کی فکری، تہذیبی اور تمدنی یلغار کے نرغے میں تھا اور مسلمان احساسِ کمتری کا شکار تھے، حضرت مولانا نے اس حملے کا مقابلہ سنجیدہ، ٹھوس، مدلل اور موثر علمی انداز میں کیا، مغربی تمدن کو نشانہ بنایا؛ لیکن اخلاقیات کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کی احساسِ کمتری کو دور کیا، انہیں تعمیر وترقی پر ابھارا، دشمنوں کے رعب ودبدبے کے طلسم کو توڑا، اِس میدان میں مولانا کے انداز میں اعتدال ومیانہ روی اور دینی عقائد ومسلمات سے غیر متزلزل وابستگی اور عصری آگہی کا حسین امتزاج تھا، مولانا نے نہ تو مغربی تہذیب کو کلی طور پر ترک کرنے کی دعوت دی اور نہ اس کو کلی طور پر قبول کر لینے کی بات کہی، بلکہ مولانا کا انداز قدیم وجدید دونوں کو جمع کرنے اور مسلسل غور وفکر اور بحث وتحقیق کا تھا، مولانا نے اپنا فکری مسلک ودعوتی منہج اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں واضح کر دیا ہے، مولانا دینی مدارس کے طلبہ کو مخاطب کرتے تو ان سے نصاب، نظام وطریقۂ تعلیم میں جدت پیدا کرنے کا مطالبہ کرتے اور جب عصری درسگاہوں کے طلبہ کو مخاطب کرتے تو ان سے ایمان ویقین کے حقیقی سرچشمے سے رشتہ مضبوط رکھنے، تزکیۂ نفس اور حسنِ سلوک کی تلقین کرتے، علوم وفنون میں جدت اور ابتکار کی دعوت دیتے اور مغرب کی نری نقالی وتقلید سے منع کرتے۔

مولاناؒ کی جامع اور عبقری شخصیت کا راز

حضرت مولاناؒ کی اس جامع عبقری شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا میں یہ متعدد اور متنوع خوبیاں اور صلاحیتیں ایک ساتھ کیسے جمع ہوئیں، حالانکہ اگر ان میں سے ایک بھی صلاحیت کسی میں پیدا ہوجاتی ہے تو وہ عظیم رہنما بن جاتا ہے، حضرت مولانا نے اس سوال کا جواب خود دیدیا ہے، مرحوم ڈاکٹر محمد اجتبا حسینی ندویؒ کی کتاب ''الأمیر صدیق حسن خاں القنوجی جهوده وآثاره'' کے مقدمے میں حضرت رقمطراز ہیں:۔

> ''میری ولادت جس گھرانے میں ہوئی اس کا محبوب ترین مشغلہ بلکہ اس کی ''ہابی'' (Hoby) عظمائے اسلام، شخصیات، طبقات، رجال، علماء، اہلِ فضل وکمال خصوصا ہندوستانی علما، فضلا، صلحا، اتقیا اور علماء ربانیین کی سوانح عمریاں لکھنا

تھا،میری نشوونما ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس میں ہرطرف علمی اوراخلاقی اقداروروایات کا چرچا تھا،علمائے کبار اوران کے علمی کارناموں، دین سے ان کی وابستگی وپختگی،ان کی فنائیت اورمختلف صدیوں کے اصحاب فضل وکمال اور علما کے تذکرے بڑے احترام وعظمت ،ذوق وشوق، بڑے پراثرودلکش لہجے میں ہوتے تھے، جہاد وحرارتِ ایمانی کا سماں بندھ جاتا اور دل امنڈ آتے، مجلسوں پر کیف وسرور اور نشہ سا طاری ہوجاتا،ان تذکروں اورزندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ بچپن ہی سے میرے اندر صحابۂ کرام، علماء عظام اور سلف کی محبت وعظمت بیٹھ گئی، مکارم اخلاق،بلندہمتی اورعالی حوصلگی کی صفات پیدا ہوگئیں جو عام طور پر پیدانہیں ہوتیں،بچوں کی طبیعتوں میں جو انسانی صلاحیتیں اور جوہر رکھے گئے ہیں کبھی کبھی انہیں خاص تربیت، ماحول یا کوئی خاص واقعہ مہمیز کرتا ہے تو وہ اپنے فطری وقت سے پہلے ظاہر ہوجاتی ہیں۔

بچپن ہی سے میری تربیت فضائل ومحاسن سے محبت،خوب سے خوب تر کی تلاش،متضاد انسانی محاسن کو جمع کرنے،علوم ومعارف میں تنوع ومہارت پیدا کرنے، بلندہمتی اور پھران متضادصلاحیتوں کوخدمتِ دین اوراعلی مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے پر ہوئی،اور اگر اس کام کے لیے ایسے علوم بھی سیکھنا پڑے جن سے بہت سے علما اجتناب کرتے ہیں اور ان کو علوم کا تلچھٹ اورادبیات کا برادہ شمار کرتے ہیں، تو وہ بھی حاصل کیے جائیں۔

اسی طرح میری تربیت اس بات پر ہوئی کہ ان بندگانِ خدا سے محبت اورتعلق رکھا جائے جو اللہ کے فضل وتوفیق سے علمی اور عملی دونوں وجاہتوں پر فائز ہوں، دنیا اور آخرت دونوں خوبیوں کے جامع ہوں اور جو(عرف عام میں) ایک طرف وزارت وامارت کے منصب پر متمکن ہوں تو دوسری طرف تصنیف وتالیف، درس وتدریس، ارشادودعوت،اورتربیت واصلاح کےعلمبردارہوں"۔

معاصر اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کا تجربہ اور مولانا کا موقف

بحث وتحقیق اورتصنیف وتالیف میں انہماک ومشغولیت (جس کا ثبوت مولانا کی عظیم تصنیفات ہیں) مسلمانوں کی اجتماعی تنظیموں کی قیادت ورہنمائی میں حارج نہیں ہوئی،مثلاً مولانا نے دینی تعلیمی کونسل،تحریکِ اصلاحِ معاشرہ اورتحریکِ پیامِ انسانیت کی قیادت کی،اورتحریک پیام انسانیت تو ایسی تحریک ہے جس کی مثال علماء ومصلحین کی تاریخ اور سابقہ اسلامی تحریکوں میں نہیں ملتی۔

حضرت مولانا بعض اسلامی دعوتی واصلاحی تحریکوں کی سرگرمیوں میں شریک ہوئے،ان کی خدمات اورکارگزاریوں کو

سراہا، اوران میں جوانحراف اورعیوب محسوس کیے ان پر معتدل ،ناصحانہ، حکیمانہ ، موثراور مطمئن کردینے والے انداز میں نقدبھی کیا،اپنے عصر کے بڑے دانشوروں اور مصلحین سے رابطہ قائم کیا، ان کے افکار ونظریات کوقریب سے دیکھا اور خیرخواہانہ وناصحانہ انداز میں ان کومشورے دیے،حضرت مولانا کا مولانا مودودیؒ سے بھی تعلق رہااوران کے تعمیری اوراصلاحی لٹریچرکوسراہا بھی،لیکن دوسری طرف ان کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا۔

حضرت مولانا حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ سے وابستہ ہوئے ، اوران کے کام کوپسند کیا، بلکہ عملی طور پر مولانا کے دعوتی کام میں شریک ہوئے ، اور بیرون ممالک میں اس کے شارح اورترجمان ہوئے ،لیکن جب اخیر دور میں جماعت میں جمود محسوس کیا اور بعض امور میں بے جا اصرار دیکھا تو ناصحانہ انداز میں مشورے دیے اوراپنے موقف کی وضاحت کی،اس سب کا تذکرہ ''کاروان زندگی'' میں موجود ہے۔

حضرت مولانا نے ۱۹۵۱ء میں جب مصراورمشرق وسطی کا سفرکیا تو اخوان المسلمین کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں،ان کی دینی ،تعلیمی اور اصلاحی سرگرمیوں سے واقف ہوئے ، جماعت کے بانی شیخ حسن البنا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مستند معلومات حاصل کیں اور ان کی خدمات کو سراہااور جماعت کی مجلس انتظامی کے ارکان سے ملاقات اور گفتگو کی اوران کے سامنے اپنے خیالات اور تجربات پیش کیے،اخوان نے مصرکی اسلامی سوسائٹی پر جواثرات ثبت کیے اس کااعتراف مولانا نے خودنوشت سوانح حیات کاروان زندگی میں کیا ہے۔اعتراف کے ساتھ ساتھ مولانا نے جماعتِ اخوان کوخطاب کرکے ایک اہم پہلوکی طرف متوجہ کیااوردعوتِ دین کی غیرمعمولی اہمیت اورعظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''دینی دعوت وتبلیغ اوراسلامی تجدید کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے،اس کا کام اور پیغام صرف اتنا نہیں ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام، اور ایک سیاسی واقتصادی نظام کی جگہ دوسرا سیاسی واقتصادی نظام لایا جائے، نہ علم وثقافت کو عام کرنا، جہالت کو مٹانا، بے کاری وبے روزگاری کے خلاف جنگ چھیڑنا ہے اور نہ ہی معاشرتی واخلاقی خرابیوں کا علاج اس ڈھنگ سے کرنا ہے جس طرح یورپ کے مصلحین اور مغرب کے ریفارمر کیا کرتے ہیں، اس دعوت کا کام تو اس ''اسلام'' کی طرف بلانا ہے جو عقیدے، عمل، اخلاق وکردار، عبادت وسیاست، انفرادی واجتماعی سلوک سب پر حاوی ہے، اس میں قلب، ذہن ودماغ اور جسم وروح شامل ہیں، کوئی چیز اس کے دائرۂ بحث سے خارج نہیں، اس دعوت میں دل ،دماغ، اندازِ فکر، انسانی نفسیات، عقائد، ذہنیت سب کے اندر گہری تبدیلی لائی جاتی ہے، اس دعوت کا سرچشمہ قلب ہے، نہ کہ قرطاس وقلم اور تقریر کا اسٹیج،

یہ وہ دعوت ہے جو امت پر نافذ ہونے سے پہلے داعی کے جسم پر نافذ اور اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے''۔

مولانا نے اسی خطاب میں اغراض ومقاصد اور نتائج کے درمیان واضح فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دینی ودعوتی کارکنوں کی نفسیاتی کمزوری اور مادی ذہنیت کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ:۔

''دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک ہے غرض وغایت جس کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے، اور ایک ہے نتیجہ وانجام جو بعد میں ظاہر ہوتا ہے، دونوں میں بڑا بنیادی فرق ہے، جس شخص کا مقصد جاہ ومنصب اور حکومت کا حصول ہوتا ہے، حکومت حاصل نہ ہونے کی صورت میں وہ سست پڑ جاتا ہے اور جدوجہد سے کنارہ کش ہوجاتا ہے، حکومت کی فکر میں دعوت کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے، ہر وہ جماعت جو حکومت کی طلب میں تگ ودو کرتی ہے اس کی نفسیاتی کمزوری اور ذہنیت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ دعوت کی راہ میں جہاد وقربانی سے گریز کرنے لگتی ہے، یا اس راہ سے منحرف ہوجاتی ہے اور اگر حکومت حاصل ہوجاتی ہے تو پھر وہ طاقت کے نشے میں بدمست ہوجاتی ہے اور مال حاصل کرکے سرکش۔

اس لیے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس معاملے میں اپنے ذہن کو یکسو کرلیں، ہمارے پیش نظر دعوت اور صرف دعوت ہو، ایثار وقربانی کا جذبہ، اطاعت الٰہی اور حصول اجر وثواب کی فکر، آخرت میں کامیابی کی فکر دامن گیر ہو، انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنا، مخلوق خدا کے ساتھ شفقت ومحبت اور پوری انسانیت کی نجات کا جذبہ ہمارے اعصاب پر سوار ہو، پھر اگر تاریخ کے کسی اور دعوت کے کسی مرحلے میں بجز حکومت کے کسی اور ذریعے سے دعوت کا کام ممکن نہ ہو، تو داعیوں کے دل ودماغ میں دعوتی اصول ومبادی اور اس کے عقائد روح میں سرایت کرجانے کے بعد دین اور دعوت کی مصلحت کی خاطر حکومت کے لیے بھی تگ ودو کرسکتے ہیں، لیکن اس ذہنیت، مخلصانہ جذبے، پاکیزہ سیرت وکردار، امانت، دیانت داری اور سچائی سے، جیسے ہم دین کے فرائض اور عبادات کے دوسرے ارکان ادا کرتے ہیں، اور نیت درست رکھتے ہیں، ایسی صورت میں حکومت وعبادت میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا، اس لیے کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول اور اجر وثواب اور تقرب الٰہی کے لیے سب کچھ انجام دیتا ہے''۔(محاضرات فی الفکر والدعوۃ :۱/۳۸، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت، ۲۰۰۱ء، اردو ترجمہ

ماخوذ از: میر کارواں، از: ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی، ص: ۳۳۹-۳۴۳، باراول، ۲۰۰۱ء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

حکمرانوں اور سیاسی قائدین کے ساتھ مولانا کا رویہ اور ان سے گفتگو کا انداز

حضرت مولاناؒ نے ملک اور عالمِ عربی واسلامی کے حکمرانوں کو جو خطوط لکھے اور وقتاً فوقتاً جو مشورے دئے ان سے مسائل کے حل میں مولانا کے طریقۂ کار اور منہج فکر پر واضح روشنی پڑتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ملکی اور غیر ملکی حالات وواقعات پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور اعصاب پر انسانیت اور مسلمانوں کی کتنی فکرمندی سوار رہتی تھی۔ حضرت مولانا نے ایمرجنسی کے زمانے میں وزیر اعظم اندرا گاندھی صاحبہ کو ایک مفصل خط لکھا جس میں مولانا نے خط کے آغاز میں گاندھی خاندان کی خدمات کو سراہا، اندرا جی کے والد سے اپنے روابط کا ذکر کیا، کانگریس پارٹی کے مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو اور ابوالکلام آزاد جیسے عظیم لیڈروں کی ملک کی آزادی میں ان کی خدمات کا تذکرہ کیا اور جواہر لال نہرو کی بیٹی سے قوم کی وابستہ توقعات اور ملک کی سیاست میں ان کی جرأتمندی اور ذہانت کا تذکرہ کیا، اس کے بعد ملک کے موجودہ حالات اور نظام کے مظالم اور سختیوں کی وضاحت کی، خط میں مکتوب الیہا کو نفسیاتی طور پر ایسی غذا بہم پہنچائی گئی ہے جو اُس کو یہ احساس دلاتی ہے کہ تحریر میں ایک جائز حد تک مخاطب کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے، اُس کی محنت وکوشش کا اعتراف ہے، اور اُس سے کسی مایوسی یا بدگمانی کا اظہار نہیں کیا گیا ہے، خط کی تمہید اِسی نفسیاتی اصول اور حکمتِ دعوت پر مبنی ہے۔

اِسی طرح وفات سے پہلے جب حضرت مولانا بیمار تھے، تو ۲۸ رمارچ ۱۹۹۹ء کو مولانا کی عیادت کے لیے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپائی صاحب ندوۃ العلما تشریف لائے، مولانا نے اُس وقت بھی اٹل جی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ: ''ملک خطرے میں ہے، اُس کی سلامتی اور بقا کی فکر کیجیے''۔

حضرت مولانا نے ۱۹۹۰ء میں مملکتِ عربیہ سعودیہ کے فرمانروا فہد بن عبد العزیزؒ کی بہت سی خوبیوں اور کارناموں کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس کی رعایت کرتے ہوئے ان کے نام ایک خط لکھا، جس میں مخلصانہ اور بے غرضانہ طریقے پر وقت کی نزاکت کی طرف توجہ دلائی، اخلاص اور انابت الی اللہ، امکانی حد تک مملکت اور معاشرے کو مثالی اور معیاری اسلامی معاشرہ بنانے کے عزم وجدوجہد کی طرف متوجہ کیا، انابت الی اللہ اور خدا سے معاملے کو صاف کرنے اور ان کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی جو خدا کی نصرت اور حمایت سے دور کرتی ہیں، اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنا دعوتی فرض اور دینی احتساب کس غیر جانب داری اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا۔

مولانا نے ان خطوط میں مخاطبت کا جو انداز اختیار کیا ہے، وہ ناصحانہ اور دردمندانہ ہے، اس میں مخاطب کا پورا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے، کہیں بھی ناشائستہ زبان یا انداز اختیار نہیں کیا اور قرآن کریم کا اندازِ دعوت واصلاح بھی یہی ہے کہ حکمت ومودت، موعظتِ حسنہ، نصیحت آموز اور موثر انداز میں بات کہی جائے۔

حضرت مولاناؒ اور ملی مسائل

ملک اور عالمِ اسلام کے حکام اور قائدین کو مشورے دینے اور خطوط لکھنے کے علاوہ حضرت مولانا وقتاً فوقتاً عام مسلمانوں سے خطاب کرتے، حالات اور مسائل کے اعتبار سے ان کو مشورے دیتے، ان کی رہنمائی فرماتے، مسائل کے حل میں افہام وتفہیم سے کام لیتے ہوئے ملک کے دستور کے دائرے میں اقدامات کرنے کی تلقین کرتے، تشدد، احتجاج، دھرنے اور مظاہرے سے روکتے، ۱۹۹۰ء کے آخری مہینوں میں شدید فرقہ وارانہ فسادات، خوف ودہشت کی فضا میں اس کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں اور گزشتہ تاریخ اور رحمت ونصرتِ الٰہی کے واقعات کی رہنمائی میں ایسے مثبت مشورے دیے جائیں، رجوع الی اللہ، اصلاحِ حال، وقت کے تقاضوں کی تکمیل اور حقیقت پسندی کا راستہ دکھایا جائے جس سے خوف وہراس کم ہو اور رحمتِ الٰہی متوجہ ہو اور فضا کی درستی، جان ومال کی حفاظت اور ملی تشخص کی بقا میں مدد ملے، اِس تناظر میں حضرت مولانا نے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے ''ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک راہ عمل'' کے عنوان سے ایک کتابچہ تیار کیا۔

مسلم سماج کی اصلاح کا طریقہ کار

حضرت مولانا نے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اور اسلام مخالف عادات واطوار سے اس کو پاک کرنے کے لیے اصلاح معاشرہ تحریک شروع کی، جس کا پہلا اجتماع ندوۃ العلما میں منعقد ہوا، پھر متعدد شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، اور اس طرح اس تحریک نے پورے ملک میں ایک زبردست مشن کی شکل اختیار کرلی، معاشرے پر اُس کے بڑے اچھے اثرات مرتب ہوئے، اِس تحریک کا مقصد استحصال، شادی وغیرہ میں فضول خرچی، اسراف، جہیز کی لعنت،، خاندان یا طبقے یا معاش کی بنیاد پر تفریق کو ختم کرنا تھا، اس تحریک کے پیچھے مولانا کا یہ تصور کارفرما تھا کہ ہر انسان کے دو گھر ہیں، ایک چھوٹا گھر اور دوسرا بڑا گھر، اور اصلاح کا عمل اسی وقت انجام پاسکتا ہے جبکہ چھوٹے اور بڑے دونوں گھر کی اصلاح ہوجائے۔

افہام وتفہیم اور پرامن گفتگو کی تلقین

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کے سامنے اپنی تقریر، تحریر اور گفتگو کے دوران اس بات پر زور دیتے رہے کہ مسلمانانِ ہند اپنے وطن کی تعمیر وترقی کے کاموں میں بھرپور حصہ لیں، اور اپنی سوسائٹی سے پسماندگی اور پستی، کشمکش ومعرکہ آرائی اور جہالت ونادانی کے اسباب وعوامل کا خاتمہ کریں اور مسلمانانِ ہند کی مساعی جمیلہ اس ملک کے لیے باعث خیر وبرکت ثابت ہوں، احتجاج، مظاہرے، دھرنے اور تشدد سے باز رہیں، شاہ بانو کیس، بابری مسجد اور یکساں سول کوڈ کے سلسلے میں مولانا نے مسلمانوں کو قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اقدامات کرنے کا مشورہ دیا، مسائل کو باہمی افہام وتفہیم اور پرامن گفتگو کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا اور احتجاج اور تشدد سے باز رہنے کی تلقین کی، اُن کی تقریر کا مرکزی موضوع قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ ''یا أیھا الذین آمنوا إن تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً'' ہوا کرتا تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرقان کی یہ تشریح فرماتے کہ مسلمانوں کی زندگی، غیروں

کے مقابلے میں زندگی کے تمام شعبہ جات میں ممتاز ونمایاں ہو، اورصدق وصفا، امانت ودیانت، اخلاص وللّٰہیت، جدوجہد، ہمدردی وغمخواری، مساوات وبرابری اور ایثار وقربانی سے متصف رہے تاکہ مسلمانانِ ہند ان صفات وامتیازات کی بدولت، برادرانِ وطن کی محبت والفت اوراعتماد کے حق دار بن سکیں، وہ ان کو باعثِ برکت سمجھیں، اِس ملک کے لیے ان کو وبال اورمصیبت نہ تصور کریں۔

رابطہ ادب اسلامی

حضرت مولاناؒ کو یہ احساس تھا کہ دنیا میں فساد کا بڑا ذریعہ ادب اور ذرائع ابلاغ ہیں جوادب ہی کا ایک حصہ ہیں، اُن کے عہد میں ترقی پسند ادبا اور مغربی ادب سے متاثر شخصیا ت نے ذہن سازی کا جوکام کیا اُس کے علاج کے لیے اسی ذریعے کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے انہوں نے ادب اسلامی کی ضرورت محسوس کی اور اس کو عام کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا وجود ہوا۔ دعوتی، اصلاحی اور فکری کوششوں کے لحاظ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ عظیم اسلامی وانسانی داعی، عظیم مفکر، علمی ودعوتی جہاد میں سرگرداں ومنہمک، ملک وملت کوخطرات سے آگاہ کرنے اور صحیح راہِ عمل بتانے والے عظیم دانشور تھے، دعوتِ فکروعمل میں دوسرے داعیوں، عالموں اور مفکروں سے ممتاز ومنفرد تھے، اپنے اسلاف کے بہترین جانشین اور ان کی خصوصیات ومیراث کے امین ووارث تھے، حضرت مولانا قرآنی انسان تھے، اس لیے مولانا کا منہج دعوت قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تھی۔

﴿ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اوراچھی نصیحت کے ذریعے بلاتے رہئے اوراچھے طریقے پران سے بحث کیجیے، بلاشبہ آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹک گیا اور وہ صحیح راستہ چلنے والوں کوبھی خوب جانتا ہے)۔

یہ مقالہ مولاناؒ کے ایک موثر اقتباس پرختم کرتا ہوں جس میں مولانا وقت کی ایک اہم ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔: ''اسلام کو اِس وقت نئے خون، نئی امنگوں، نئے ولولوں، نئے جوشِ عمل اور جذبۂ قربانی کی ضرورت ہے، یہ نیا خون، نیا جوش اور قربانی بہت سی جگہ موجود ہے، لیکن پست مقاصد اور غلط میدانوں میں صرف ہورہا ہے، جو چیز اسلام کے کام نہیں آرہی ہے، وہ صرف ضائع نہیں ہورہی ہے، بلکہ دنیا کی تباہی کا باعث ہورہی ہے، اسلام کی دعوت ابھی اُن گوشوں میں نہیں پہنچی، ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کواُن قوموں اور طبقوں تک پہنچا کر اسلام کی طاقت اور ایمان کی اُن کیفیات کا تماشہ دیکھیں جوہمیں دنیا کی تاریخ میں نومسلموں کی زندگی میں وقتاً فوقتاً نظر آتی ہیں۔ ہمیں اُن نومسلموں کی زندگی میں اسلام کی صداقت اور رسول اللہؐ کی رسالت وامامتِ عالم پراس درجے کا یقین، ذاتِ نبوی کے ساتھ عشق وشیفتگی اور اسلام کی برتری کے لیے ایسی جدوجہد اور سرفروشی دیکھنے میں آئے گی جس کے سامنے ہم پشتینی مسلمانوں کوشرم آئے گی اور جس کی نظیر صدیوں سے دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی''۔ (اصلاحیات: ص:۵۹)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور نئی نسل کے تحفظ ایمان کے لیے ان کی فکرمندی

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

نئی نسل امت کا قیمتی سرمایہ :

کسی بھی ملک میں نوجوان نسل کو اس ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ تصور کیا جاتا ہے، اور اس کی تربیت کا خاص اہتمام ہر سطح پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس وقت عالمگیر سطح پر نوجوانوں کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے، لیکن اس کو جسمانی صحت اور معاشی مقاصد تک محدود رکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کے لیے ہر قسم کے کھیل کی سرپرستی حکومتوں کی طرف سے جاری ہے، اور مختلف النوع کھیلوں میں ہر ملک اپنے نوجوانوں کو آگے بڑھانا چاہتا ہے اور وہ اس کی تربیت دے کر اپنے نوجوانوں کو نمونے کے طور پر پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

نوجوانوں کی اس اہمیت کے پیش نظر اسلام میں ان کو بہت خاص مقام عطا کیا گیا ہے، ان کو مستقبل کا معمار اور انسانی قیادت کا سپہ سالار قرار دیا گیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سبھی نوجوان عنصر کو خاص اہمیت دی اور ان کو مرکز توجہ بنایا، صحابہ کرامؓ میں ایک بڑی تعداد نوجوانوں کی تھی، ان میں علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، مصعب بن عمیر، سعد بن ابی وقاص، محمد بن ابوبکر، عبداللہ بن عبداللہ بن ابی، سعد بن ربیع رضی اللہ عنہم وغیرہ، یہ دراصل اس نئے دین کا بہت بڑا سرمایہ تھے، اور انہوں نے تاریخ اسلام میں اسلامی زندگی کی بہترین نمائندگی کی اور ان کے ذریعے سے اخلاقی بلندی اور عظمت اسلام کا پیغام مستقبل میں آنے والی نسلوں اور قوموں تک پہونچا، یہی وہ نوجوان تھے جو مدرسۂ نبوت کے تربیت یافتہ اور دین کے سپاہی کی شان رکھتے تھے، انہوں نے ہر چیز کو دین کی مصلحت کے سامنے قربان کرنے میں ذرا بھی پس وپیش سے کام نہیں لیا، ان کے نزدیک جان کی قیمت صرف اسی قدر تھی کہ وہ اسلام کی سربلندی کی راہ میں قربان ہو جائیں، وہ ''کوئے دوست'' میں گردن کٹوانا اپنی عظیم سعادت تصور کرتے تھے۔

اصحاب کہف کا ایمان نئی نسل کے لیے نمونہ

قرآن کریم نے اگرچہ اصحاب کہف کے نوجوانوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے:﴿ **إنهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى، وربطنا على قلوبهم ، إذ قاموا فقالوا ربنا رب السموات والأرض لن ندعو من دونه إلها، لقد قلنا إذاً شططا ،هؤلاء قومنا اتخذوا**

من دونہ آلھة ، لولا یأ تون علیھم بسلطان بین، فمن أظلم ممن افتری علی اللہ کذبا ﴾۔ یہ لوگ (چند) نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے انھیں ہدایت میں ترقی دی تھی ، اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے تھے، جب وہ پختہ اور مستعد ہو گیے تو بولے : ہمارا پروردگار وہی تو ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، ہم تو اس کے علاوہ کسی معبود کو نہ پکاریں گے، ورنہ پھر تو ہم بڑی ہی بیجا بات کے مرتکب ہوں گے ، ان لوگوں (یعنی) ہماری قوم والوں نے اللہ کے علاوہ اور معبود قرار دے رکھے ہیں، یہ لوگ ان معبودوں (کے وجود) پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے ، سو اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے ۔ (الکھف: ۱۳۔۱۵)۔

ایک موقع پر نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی آیت تلاوت کی ، اور اس کی تشریح کرتے ہوئے کچھ اس طرح مخاطب ہوئے :

''میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ﴿ إنھم فتیة ﴾ وہ گنتی کے چند نوجوان تھے ، حکومت وقت نے غذائی سامان اور معاشی وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا ، وہ غلہ دے تو لوگوں کو غلہ ملے ، وہ لوگوں کو ملازمتیں دے تو لوگوں کو ملازمتیں ملیں، تو وہ حکومت گویا ایک طرح سے ''مصنوعی رب'' بن گئی تھی ﴿ آمنوا بربھم ﴾ لیکن وہ اپنے حقیقی رب پر ایمان لائے کہ ہمارا پالنے والا ، ہمیں غذا دینے والا اور ہماری زندگی کی ضروریات پوری کرنے والا ، ہمیں عزت دینے والا وہ کوئی اور ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ رب حقیقی ہے ، جب انہوں نے یہ منزل طے کر لی تو ﴿ زدناھم ھدی ﴾ ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب عیسائیت نئی نئی جزیرۂ نمائے سینا اور اپنے اصل مرز بوم سے نکل کر روما پہنچی تو وہاں کٹر قسم کی بت پرست حکومت تھی ، جب یہ داعی وہاں پہونچے تو ان کی تبلیغ سے نوجوان بھی متاثر ہونے لگے ، تاریخ کے بہت سے ادوار میں ایسا نظر آتا ہے کہ نوجوان پہلے متاثر ہوئے ہیں، اس لیے کہ زیادہ عمر رکھنے والے معمر لوگوں کے ساتھ بہت سے وزن بندھے ہوتے ہیں جیسے تیرنے کے لیے آپ دریا میں جاتے ہیں، جتنے ہلکے ہوں گے، اتنی ہی آسانی سے تیر سکیں گے، لیکن اگر کسی کے ساتھ بوجھل پتھر بندھے ہوں، کچھ سامان بھی اس کے ساتھ ہو تو اس کے لیے دریا کو پار کرنا مشکل ہوگا، جو جتنا ہلکا ہوتا ہے، وہ اتنی ہی جلدی منزل طے کرتا ہے: '' سبک سار مردم سبک تر روند''۔ (خطبات مفکر اسلام ج ۴ ص: ۱۸-۱۹)

نئی نسل کی ذمہ داری اور فرائض :

اس میں ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہو جانا چاہئے ، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہئے ، نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مفکر اسلامؒ نے سیرت کی تعمیر کی طرف توجہ دلائی اور کتاب وسنت کی روشنی میں اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا پرخلوص مشورہ ہمیشہ دیا، اس لیے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے زمانے میں خاص طور سے

لوگ دوسروں کو نصیحتیں کرنے کا جذبہ ضرورت سے زیادہ رکھتے ہیں اور خود اپنی اصلاح حال کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور نہ زندگی کا جائزہ لینے کی فرصت ملتی ہے اور ہمارے قول وعمل میں مثبت کے بجائے منفی پہلو کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے، اس طرز عمل کو بدلنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ ذمہ داری خاص طور سے ہماری نوجوان نسل پر عائد ہوتی ہے۔لندن کی ایک تقریر میں ۱۹۶۴ء کے دوران مسلم نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا نے کہا تھا:

’’آپ کے اس مجمع میں بہت سے ایسے نوجوان ہیں جو اپنے اپنے ملکوں کی زمام قیادت ہاتھ میں لیں گے اور وہاں کی بڑی اہم ذمہ داری سنبھالیں گے، آپ یہاں تعلیم حاصل کررہے ہیں، لیکن آپ کے ملکوں میں قیادت کی مسندیں اور رہنمائی کی کرسیاں آپ کی منتظر ہیں، میں آپ کی روشن پیشانیوں کی لکیروں اور خطوط میں آپ کے درخشاں مستقبل کو دیکھ رہا ہوں، کسی زمانے میں کسی ملک کی قیادت حاصل کرنے کے لیے اور کسی ملک وقوم کو اپنے اقتدار وانتظام میں لینے کے لیے زور بازو اور تلوار کے جوہر کی ضرورت تھی، سکندر اور چنگیز وہلاکو نے نوک شمشیر سے دنیا فتح کی اور قوموں کو مسخر کیا، اب اس کے لیے جنگی قوت کافی نہیں، اس وقت قیادت اور اقتدار کے لیے علم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس وقت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اور خود اسلامی ممالک جمہوریت کے جس راستے پر چل رہے ہیں اور جن حالات ومسائل کا ان کو سامنا ہے، ان کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان ملکوں کی سربراہی اور ان کی قیادت وہی لوگ کریں گے جو جدید علوم سے واقف ہیں ،مغربی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں اور جن کو جدید جمہوری نظام میں اقتدار کے منصب تک پہنچنے کے لیے ضروری وسائل ومواقع حاصل ہیں ،اس کی بنا پر امید کی جاسکتی ہے کہ آپ اپنی ان صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے ذمہ داری کی ان جگہوں تک پہنچیں گے اور آپ کو اپنے ملک وقوم کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا، یہ آپ کے لیے ایک بڑا نازک امتحان ہے، ان ملکوں کی قسمت بڑی حد تک آپ سے وابستہ ہے اور ان کے مستقبل کا انحصار آپ پر ہے۔(خطبات مفکر اسلام ج ۳ ص:۷۳-۷۴)۔

عرب نوجوان اور حضرت مولانا کی فکر مندی

حضرت مفکر اسلامؒ نوجوانوں سے عظیم والہانہ تعلق رکھتے تھے، ان کو مستقبل کا معمار اور قوموں کی قسمت کا تاجدار سمجھتے تھے، ابتدائی دعوتی اور تربیتی دور میں بیسویں صدی کے نصف ثانی کا آغاز کرتے ہوئے ۱۹۵۱ء میں جب مصر تشریف لے گیے تو وہاں کے نوجوانوں نے عقیدت وفریفتگی کے ہالے میں ان کو گھیر لیا ،اور ان نوجوانوں سے مل کر انہوں نے نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ پر امید اور مستقبل بعید تک نظر ڈالنے پر اکتفا کیا، بلکہ اسلام کے مستقبل کا ان کو روشن ستارہ قرار دیا اور ان کے عزم وحوصلہ کو دیکھ کر ان کو اپنا مرکز توجہ بنایا اور وہاں کی مختلف تنظیموں، اسلامی مرکزوں اور شبان المسلمین کے سربراہوں کی سرگرمیوں کی دیکھ کر بے ساختہ ان کے زبان وقلم سے ’’إلی الرایۃ المحمدیۃ أیھا الشباب‘‘ (اے نوجوانو! محمدی جھنڈے کے نیچے آجاؤ)، اور ’’إلی الإسلام من جدید‘‘ (نئے سرے سے اسلام کی طرف لوٹو) کا آوازہ بلند ہوا، اس موقع پر ہم اس تقریر کا اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو مصر میں ازہر اور کالج کے نوجوانوں کے سامنے کی گئی تھی:

’’میں نے ان کو دین اور دینی تحریکات سے متعلق

باتوں کے سننے کا مشتاق و پیاسا پایا، کلیۃ اُصول الدین کے طلبا میں سے ایک ذہین طالب علم یوسف قرضاوی(۱) اسٹیج پر آئے، اخلاص وحرارت ایمانی سے بھرپور سلجھی ہوئی مختصر تقریر کی، پھر اس رات کے مقرر کو خوش آمدید کہا اور اس کو دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے پیش کیا۔

میں نے تقریر شروع کی اور کہا کہ اس عالم کی دو شکلیں ہیں، ایک شکل تو خالق کائنات اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھتی ہے ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں اور نہ اس کے بارے میں ہم سے کچھ پوچھا جائے گا، وہ ہے خلق وتکوین کی شکل، اللہ تعالیٰ نے جیسا چاہا اس عالم کو بنایا، وہ خوب جاننے والا ہے اور باخبر ہے، اللہ ہی کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مستحکم کیا، ہم صرف اس کے مکلف ہیں کہ اس میں غور وفکر کریں اور مخلوق کے ذریعے سے خالق کو پہچانیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السموات والأرض، ربنا ماخلقت هذا باطلا﴾ (وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں اور بیٹھنے کی حالت میں اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، اور غور کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش کے بارے میں، اے ہمارے رب! تو نے اس کو بے مطلب نہیں پیدا کیا) لیکن ہم اس عالم کی خلق وتکوین کے مکلف نہیں ہیں اور ہم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ستاروں کو اس طرح پھیلایا اور بکھیرا کیوں گیا، سورج مشرق سے کیوں طلوع ہوتا ہے، مغرب میں کیوں غروب ہوتا ہے، پہاڑ یہاں کیوں نہیں ہیں، وہاں کیوں ہیں؟ کائنات کی تخلیق کے بارے میں اسی طرح اور دوسرے سوالات ہو سکتے ہیں، مگر ہم دوسری شکل کے مکلف ہیں، اس کے متعلق ہم سے سوال ہوگا وہ کائنات کے اس وسیع نظام کی تشکیل وتنظیم کے بارے میں جس کو خدا نے بنایا ہے اور اس کو ہمارے ہی لیے مستقل ومحکم اور اچھی طرح منظم ومرتب کیا ہے، اور وہ بنیادی اصول جن کو قانون الٰہی کہا جاتا ہے اور جو ہم کو اس تنظیم کی بقا اور عالم کی ذمہ داری سنبھالنے کا مکلف بناتے ہیں، خدا نے اس زمین پر خلیفہ بنا کر ہم پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے: فرمایا: ﴿إني جاعل في الأرض خليفة﴾ میں زمین پر ایک خلیفہ اور جانشیں بنانے والا ہوں، یکے بعد دیگرے انبیائے کرامؑ اسی لیے تشریف لے آئے کہ اس عالم کو منظم کریں، یہاں کی زندگی کو اللہ کی پسند ورضی کے مطابق ڈھالیں اور سنواریں، اس میں سے ہر ایک اس عالم کی اصلاح اور اس کے نظم ونسق کی حفاظت کا حریص اور خواہاں تھا، یہاں تک کہ جب بعض بدطینت لوگوں نے زمین کے اس نظام کو بگاڑنا چاہا تو انہوں نے کہا "تم لوگ زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اس کی درستگی کے بعد﴿ولاتفسدوا في الأرض بعد إصلاحها﴾ اور جب کسی قوم یا خاندان یا کسی جماعت نے اس بگاڑ اور عالم کے نظام کو نقصان پہنچانے پر کمر باندھ لی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو نیست ونابود کر دیا"۔ (شرق اوسط کی

ڈائری: ۷۳-۷۴)۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ تھا کہ مستقبل در اصل انہیں عرب نوجوانوں کا ہے، جنہوں نے اسلام کو سینے سے لگا یا اور اس کو ایک آسمانی پیغام اور ایک عظیم نعمت سمجھ کر اپنے رگ وپے میں سمولیا، میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے سب سے پہلے مخاطب جزیرۂ عربیہ کے نوجوان ہی تھے، اگر چہ وہ اپنے آباء واجداد کے طریقے پر آخری درجے تک قائم تھے، اور اس طریقے کو چھوڑنا ان کے لیے دشوار گذار امر تھا، یہاں تک کہ وہ کسی نئی دعوت بلکہ کسی نئی آواز کو سننے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن جب حقیقت ان پر واشگاف ہوگئی اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ خدائے واحد کے سامنے جھکنے اور اس عظیم کائنات کو اس کی عظمت وکبریائی کی ایک نشانی سمجھنے کا یقین ان کے دلوں میں پیوست ہوگیا تو وہ اپنی اس دعوت کو پھیلانے اور اس کو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے راہ سعادت کھلنے والا اور ذات الٰہی سے ایک مضبوط تعلق قائم کرنے والا اور اس کی رحمتوں سے زندگی کو معمور کرنے والا اور دین ودنیا کی خوبیوں اور کامیابیوں کو جمع کرنے والا تابندہ وپائندہ دائمی مذہب کے علم بردار اور داعی بنکر دنیا کے گوشے گوشے میں نکل پڑے، یہ وہی عرب نوجوان تھے جنہوں نے اسلام کی روح کو سمجھا تھا اور اس کی تاثیر ونتائج کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا اور نہ صرف جزیرہ عرب بلکہ پوری دنیا میں انسانیت کی بے توقیری اور اس کی بے عزتی کے حالات سے واقف تھے اور انہوں نے انسانوں کو بے جان پتھروں اور بے حس وحرکت معمولی چیزوں کے سامنے جھکتے ہوئے اور ان کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تھا، وہی عرب نوجوان اب اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور لوگوں کو بندوں کی بندگی کی ذلت سے نکالنے اور عدل وانصاف کا بول بالا کرنے اور ظلم وجور کی خندقوں کو پاٹنے اور کفر وشرک کی تمام شکلوں کو مٹا کر اللہ اور صرف اللہ کے سامنے سر جھکانے کی عالمگیر دعوت کو عام کرنے نکلے، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس دنیا کا نقشہ بدل دینے میں پوری طرح کامیاب ہوگئے۔

ان عرب نوجوانوں کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے حضرت مفکر اسلامؒ نے کچھ اس طرح اس کا نقشہ کھینچا ہے:

"یہ عرب جب دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکلے، بلکہ انسانیت کا نجات دہندہ بن کر نکلے، اس مقصد سے نکلے کہ انسانیت کو وحشت وبربریت کی چنگل سے چھڑائیں، اور انسانیت کو اس ظلم وجور سے نجات دلائیں، جو صدیوں سے جاری تھا، جب ان پر وہ حقیقت کھلی جو اوپر بیان ہوئی، وہ جب لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت واطاعت کی طرف بلانے کے لیے نکلے، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف لانے کی غرض سے نکلے، ادیان ومذاہب کے ظلم وجور سے نکال کر اسلامی عدل وانصاف کی طرف بلانے کے مقصد سے نکلے تو یہ بے روح جاہ وجلال ان کو ہیچ نظر آئے، بڑی بڑی حکومتیں ان کو کٹھ پتلی کا کھیل معلوم ہوئیں، ان کے جھنڈوں کو سرنگوں کرنا بچوں کا کھیل معلوم ہوا، آسمان سے باتیں کرنے والی فلک بوس عمارتیں ان کو خس وخاشاک کا ایک تودہ معلوم ہوئیں، بڑے بڑے لشکر ان کو بھیڑ بکری کا گلہ معلوم ہوئے، انہوں نے ان کو غیر عاقل بے شعور جانور سمجھا جس میں نہ رحم وکرم کا مادہ ہے

، نہ لطف ومہربانی کا جذبہ، وہ انہیں انسانوں کی شکل میں بھیڑیے اور درندے نظر آئے۔

قرآن پاک نے اَن پڑھ عربوں کو، قافلۂ حیات سے بچھڑے ہوئے عربوں کو، تہذیب وتمدن سے نا آشنا عربوں کو قوت وطاقت اور حوصلے سے بھر دیا، انہوں نے ان کے سرد اور خالی دلوں کو اس نعمت عظمیٰ پر فخر وناز، خود اعتمادی وخود شناسی اور رفعت وبلندی کے لیے نئے ''سیل'' اور نئے مسالے سے بھر دیا، انہوں نے ان کو اشیا کے خواص واثرات کو جاننے کا ملکہ عطا کیا، وہ ان ساری توانائیوں سے مالا مال ہوکر نکلے اور سارے عالم کو زیر کرلیا، اس لیے نہیں کہ مالک بن جائیں، نہ اس لیے کہ اس پر حکومت وفرمانروائی کریں، جیسا کہ ان قوموں نے کیا، بلکہ وہ اس لیے نکلے تھے کہ یہ گم کردہ راہ اور در در کی ٹھوکریں کھاتی انسانیت کو خدائے واحد کے سامنے جھکائیں، اور اسے اسلام کے عدل وانصاف کے سائے میں لے آئیں''۔ (خطبات مفکر اسلام ج۴ص:۱۷-۱۸)۔

نئی نسل کو الحاد اور ارتداد سے بچانے کے لئے ایک عظیم فکری کوشش:

بیسویں صدی میں ایک نئے فتنے اور لاشعوری ارتداد کی طرف حضرت مولانا کا ذہن متوجہ ہوا، جس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یعنی یورپ کی مغربی تہذیب اپنی آب وتاب کے ساتھ عالم اسلام پر حملہ آور ہے، اور لاشعوری طور پر لوگ اسلامی شریعت اور اس کے نظام حیات سے غافل ہوکر اس تہذیب کی چمک دمک کا شکار ہوچکے ہیں، یہ فتنہ حضرت مولانا کے ذہن ودماغ پر چھایا رہا، اس کی اہمیت کے پیش نظر مولانا نے ''ردۃ ولا أبا بکر لہا'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، وہ دمشق سے نکلنے والے عربی زبان کے مشہور مجلہ ''المسلمون'' میں شائع ہوا، مضمون کی دوسری قسط ''دعوۃ جدیدۃ'' کے عنوان سے اسی پرچے میں شائع ہوئی۔

اس صورتِ حال کا حضرت مولانا پر شدید اثر ہوا، اور اسی کے نتیجے میں ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کا ادارہ قائم کیا گیا، مناسب ہوگا کہ اس لاشعوری فتنہ ارتداد کے سلسلہ میں خود حضرت مولانا کی تحریر پیش کردی جائے، تاکہ مفہوم اچھی طرح واضح ہوجائے:

''میں نے اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشان دہی کی، یہ وہ ارتداد ہے جو شرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی وتہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے، اور یہ سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہد رسالت ہے لیکر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے، یہ دین لا دینیت ہے، جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کے بے شمار افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے، لیکن پچھلی ارتدادی تحریکوں اور لہروں کے برخلاف اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریاتِ دین اور حقائقِ دینی کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلی مذہب کا خود اعلان کرتا ہے، اور نہ اس کا اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور نہ اس سے فصل وانقطاع کا وہ معاملہ کرتا ہے، جو مرتدینِ سابقین کے ساتھ کیا جاتا تھا، درحقیقت اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلے کی طرف توجہ فاضلِ گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب

مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی، میں نے یہ بنیادی تصور لے کر اس کو اس مضمون میں شرح وبسط کے ساتھ لکھا، لادینیت کی عالمگیر اشاعت کا راز بھی بتایا، عالم اسلام میں اس کے اہم مظاہر کی بھی نقاب کشائی کی، پھر اس کے علاج کے طریقے، نئی طاقتور دعوت ایمان، اور اس کے لیے نئے علمی اداروں کی ضرورت، نئے ذہن کو سامنے رکھ کر طاقتور لٹریچر کی تیاری پر زور دیا، اور اس سنگین صورتِ حال کی تصویر کشی کی، جس سے عالم اسلام دوچار ہے۔

یہ مضمون دو قسطوں میں " ردة جديدة " اور "دعوة جديدة" کے عنوان سے ''المسلمون'' میں شائع ہوا، بعد میں یہی ایک مستقل رسالہ کی شکل میں "ردة ولا أبا بكر لها" (فتنہ ارتداد ہے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ابوبکر نہیں) کے عنوان سے شائع ہوا، جو مختلف وقتوں میں اور مختلف اداروں کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوا، اور منی وعرفات تک میں اس کی تقسیم ہوئی، غالباً راقم کا کوئی مضمون، رسالہ یا کتاب اتنی بڑی تعداد میں نہ شائع ہوئی، نہ اثر انداز، اس مضمون کے لکھنے اور شائع ہونے کے بعد شدت سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اعتقادی اور تہذیبی ارتداد اور اس فکری واخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مستقل مجلس (Academy) کی تاسیس ہونی چاہئے، جو اس کام کا بیڑا اٹھائے، اور اسی کو اپنا موضوع بنائے، چنانچہ مئی ۱۹۵۹ء میں ایک صاحب خیر کی ایک ہزار کی رقم سے اس کی تاسیس ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' Academy of Islamic Reserch and Publication کے نام سے عمل میں آئی ، اس نے پہلی کتاب مقالات سیرت مصنفہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے نام سے شائع کی، ان سطور کی تحریر کے وقت تک اس کی مطبوعات کی تعداد ۱۶۸ تک پہنچ گئی ہے، اور کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم انگریزی میں اس تحتی براعظم میں کسی ادارے نے دعوتی وعلمی انداز اور اچھی اور معیاری انگریزی میں دین وشریعت، عقائد اور ارکان اسلام، حدیث وسنت، سیرت طیبہ، خلفائے راشدین، اور تاریخ اصلاح وتجدید، نیز ہندوستان میں اسلام اور مسلمان کے تعمیری ودفاعی کاموں کے تعارف میں اس سے زیادہ لٹریچر شائع نہیں کیا، یورپ، امریکہ، اور جنوبی افریقہ اور عرب ممالک میں اس کی کتابیں بحمد اللہ بہت مقبول ہیں، یہ سب کام محض تائید الٰہی سے ایسے تھوڑے سرمایے اور ایسے محدود ومختصر عملے کے ذریعے وجود میں آیا جس پر آسانی سے یقین کرنا مشکل ہے''۔ (کاروان زندگی ج ۴/۲۵۲-۲۵۴)۔

دینی تعلیمی کونسل الحادی تعلیم کے خلاف مثبت پہل:

لاریب حضرت مولانا کو پوری دنیا کی امت مسلمہ سے نہایت ہی قلبی اور روحانی تعلق تھا، وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان صراط مستقیم پر قائم رہیں، اور دنیاوی وجاہت کو اسلام پر کسی حال میں بھی ترجیح نہ دیں، ان کو یہ بھی احساس تھا کہ مسلمان اپنے ایمانی طریقے اور عقیدے کے ستھرے پن سے دور ہوگیے ہیں، دنیا کی مادی تہذیبوں اور تمدنی فلسفوں کا اثر بڑی حد تک قبول کرنے لگے ہیں، وہ مادی مال ومتاع کی بھول بھلیوں میں پہنچ کر اپنے عقیدے اور ایمان سے کسی حد تک بیگانہ ہوگیے ہیں ، انہوں نے مختلف اسلوب وانداز کے ساتھ امت مسلمہ کو خواہ عرب ہو یا عجم، ہر جگہ مخاطب کیا، اور ان کو اپنا منصبِ قیادت، اور اپنی عظمت رفتہ کا

احساس دلایا، وہ ہر اس تحریک اور دعوت کے مؤید اور اس سے منسلک تھے، جو اسلام کی سربلندی، اعلائے کلمۃ اللہ اور مسلمانوں کو ان کے منصب قیادت وہدایت کی طرف لے جاتی ہو، اور دین ودنیا کے بارے میں اس کا موقف واضح ہو، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ان کے وسیع قلب میں بڑی گنجائش تھی، اور وہ ان کے مستقبل کے لیے بے حد فکر مند تھے، ان کی آنے والی نسلوں کے لیے دین پر باقی رہنے کی بے چینی ان کے رگ وریشے میں سرایت کر گئی تھی، وہ دینی تعلیمی کونسل کے ذریعے آنے والی نسلوں کے بنیادی عقائد اور ان کے ایمان بالغیب کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت بے چین رہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے اس اہم ترین پہلو کو بے توجہی کا شکار بنا دیا تو مسلمان بچوں کو عقیدۂ توحید ورسالت، حساب وکتاب اور آخرت کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہو سکے گا، اور ان کے اور غیر مسلم نسل کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہ پائے گا، ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بارے میں تو شاید ہی کچھ معلوم ہو، لیکن بتوں کے آگے جھکنے اور دیوی دیوتاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا، اس صورت حال کو روکنے کے لیے جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، بچوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ کرنے کی انتہائی ضرورت اور وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

ان کا خیال تھا کہ اگر انبیائے کرام بھی اپنی نئی نسلوں کے دین وایمان کی فکر نہ کریں تو وہ بھی غفلت کا شکار ہو سکتی ہیں، یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنی وفات سے قبل اس بات کا اطمینان کر لینے کا اتنا شدید تقاضہ تھا کہ میری اولاد میرے نہ رہتے ہوئے کس چیز کی عبادت کرے گی، حالانکہ اولاد کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ والد کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، انہوں نے اپنی اولاد کو جمع کر کے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے، اولاد نے یک زبان ہو کر عرض کیا کہ اسی اللہ کی عبادت کریں گے، جس کی عبادت آپ اور آپ کے آباء واجداد اور اولیاء کرام کیا کرتے تھے، قرآن کریم میں ہے:

﴿ أم كنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت، إذقال لبنيه: ما تعبدون من بعدى ، قالوا نعبد إلٰهك وإلٰه آبائك إبراهيم وإسماعيل وإسحاق إلٰها واحدا ونحن له مسلمون ﴾ (۱) ترجمہ: ''کیا حضرت یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے، جب انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے، تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی، اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے معبود کی، جو معبود ایک ہی ہے اور ہم اس کے فرمانبردار رہیں گے۔''

حضرت مولانا اکثر اپنی تقریروں میں اس آیت کو پڑھ کر بڑے درد سے فرمایا کرتے تھے کہ ہماری اولاد اور آنے والی نسلوں کو دین پر باقی رکھنے اور اللہ کی عبادت پر ثابت قدم رکھنے ہی میں ہمارے مسائل کا حل موجود ہے، انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

''کسی ملک کے مسلمانوں کا خواہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہوں، یا اقلیت میں، اولین واہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے بالغین کی دینی واقفیت اور بچوں کی دینی تعلیم کا کیا بندوبست کیا ہے؟ میں اپنے محدود مطالعہ اور دینی واقفیت کی بنا پر یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ یہ مسئلہ ان کے تمام قومی مسائل سے مقدم اور اہم ہے، یہ ان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے، یہ ابدی

نجات یا اس کی ہلاکت کا سوال ہے، ایک ایسے ملک میں بھی جہاں کوئی متوازی اور جارحانہ نظام تعلیم موجود نہ ہو، جہاں بچوں کی سادہ تختی پر اسلامی تعلیم کے نقوش ثبت کرنے کی پوری سہولت اور گنجائش ہو، یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، مسلمان اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام اور اپنی آئندہ نسلوں کے اسلام پر قائم رکھنے کا اطمینان حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں، اور ان کو ایک دن کی تاخیر اور ایک لمحہ کے التوا کے بغیر وہ تمام تدبیریں اور وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو اس مقصد کے حصول کے لیے مفید اور ضروری ہوں۔

لیکن اس ملک میں ان کی ذمہ داری دوہری اور نہایت شدید ہو جاتی ہے، جہاں لازمی طور پر کوئی ایسا نظام تعلیم ونصاب تعلیم جاری ہو جو اسلام کے بالمقابل عقائد کی تعلیم دیتا ہو اور جس کے مضامین اور مندرجات توحید ورسالت کے بنیادی اسلامی عقائد کے منافی اور شرک وگمراہی کے علانیہ بلکہ تکلف کے ساتھ بھی مسلمان نہیں رہ سکتا، جہاں مسلمانوں کی اس محبوب شخصیت کا جس کی محبت وتعظیم مسلمانوں کا ایمان ہے، تذکرہ وتعارف ایسے نازیبا اور خلاف واقعہ انداز میں کیا جائے، جس کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی روحانی اذیت اور ایمانی خطرہ ہے، جہاں قوموں کی تاریخی شخصیتوں کو ایسے حقیر وداغدار طریقے پر پیش کیا جائے کہ مسلمان بچوں میں حقارت اور اپنے ماضی سے نفرت پیدا ہو، جہاں مسلمانوں کو جو اس ملک کے برابر اور ہندوستانی جمہوریہ کا ایک ضروری عنصر ہیں، ان الفاظ سے یاد کیا جائے جو نیچ ذات اور طچھ اقوام کے لیے بولے جاتے ہیں، ایسے حالات میں مسلمانوں پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک اس نامناسب صورتِ حال کی اصلاح وتبدیلی کی کوشش، دوسرے جب تک وہ قائم ہے اس کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان، اور خواہ وہ قائم رہے یا دور ہو جائے، دونوں حالتوں میں مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم کا مستقل بندوبست"۔

(کاروان زندگی: ۱۹۴۔۱۹۶)

نئی نسل کے ایمان کا تحفظ زبان وادب کے ذریعے:

نئی نسل کے تحفظ ایمان کے لیے حضرت مولانا نے ادب اطفال کے نام سے ادبی وعلمی موضوعات پر اپنے مطالعے کی روشنی میں ایک جامع نصاب تیار کیا، اس نصاب کا مقصد ہی یہ تھا کہ نئی نسل اپنے اصل سرچشمے سے وابستہ ہو، اور اپنی تاریخ سے وابستہ ہو، چنانچہ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی میں دارالعلوم ندوۃ العلما کی جانب سے بہت سی ایسی گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جو تعلیم وتربیت، اسلامی تہذیب وتمدن کی وضاحت، مقاصد دین اور اسلامی زندگی کی تشریح، بحث وتحقیق کے معیار کی تصحیح، اور شریعت اسلامیہ کی حقانیت کو آشکارا کرنے میں بنیادی کر دار ادا کر رہی ہیں۔ آپ نے اس راہ میں عربی ادب کو ایک مؤثر ترین ذریعے کے طور پر استعمال کیا اور یہ کام ایسے نامساعد حالات میں انجام دیا جب لوگ عربی زبان کو از کار رفتہ شمار کر رہے تھے، اور اسے ایک مردہ اور زندگی سے محروم زبان سمجھ کر صرف فقہی واصولی کتابوں کے تنگ دائرے میں محدود کرنے پر زور صرف کر رہے

تھے، مگر آپ نے محض توفیق ربانی اور اپنی بلند حوصلگی کے ذریعے اس زبان کے دائرے کو وسیع کیا، حتی کہ اس کو زندگی کے مسائل، بحث ونظر، وعلم وفکر، تاریخ وتذکیر، تہذیب وتمدن، سماج وسوسائٹی، سیاسیات واقتصادیات اور عالمی مجالس سے مربوط کرکے دکھایا، اس راہ میں آپ نے زبان وقلم دونوں کا سہارا لے کر سلیس عربی زبان اور واضح اور فصیح اسلوب میں کتابوں کی تصنیف فرمائی، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلما، آپ کے مبارک دور میں اگر ایک طرف علم وادب، اور دین وشریعت کا بلند مینار تھا تو دوسری طرف قلب وقلم، ریشم وفولاد، وسیع علم اور پختہ ایمان کی جامعیت کا یکتائے روزگار نمونہ تھا۔

اسی جامع ومعتدل تخیل کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے فکر وادب اور تمدن وثقافت کے مراکز میں آئے دن تبدیلیوں، اور مادی افکار ونظریات والے ممالک کی جدید تہذیبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب درس میں قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول کے مطابق تبدیلیاں کیں، تاکہ ایک عالم دین اپنے گردوپیش کی دنیا، اور آئے دن کی فکری وعلمی وتہذیبی تبدیلیوں اور چیلنجوں سے باخبر ہوکر اللہ کی شریعت کی جانب سے دفاع کا فریضہ انجام دے سکے، اور اس پر لوگوں کا مکمل اعتماد بحال کرسکے۔ اور اسے دنیا وآخرت کی سعادتوں کے درمیان ایک رابطہ بنا سکے، چنانچہ آپ نے اسلامی ممالک کی دیگر یونیورسٹیوں کے طرز پر عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے کتابوں کی تصنیف کے ذریعہ اپنا مستقل تربیتی کورس تیار کرایا۔ ''قصص النبیین''، القراۃ الراشدۃ''، ''مختارات من أدب العرب''، منثورات من أدب العرب''، جیسی مایہ ناز کتابیں زبان وادب اور بہترین اسلوب بیان کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے دور آخر کے مصنفین کے لیے مشعل راہ کا کام دیا، اور عربی زبان کے زندہ جاوید زبان ہونے کا بین ثبوت دے کر ان کے ایمان ویقین میں اضافہ کا سامان فراہم کیا۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ترویج کے لیے حضرت مولاناؒ کی یہ کوششیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ مقصدیت کی روح سے معمور تھیں اور اگر یہ کہا جائے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی جو بھی، جس شکل میں بھی، اور جہاں کہیں بھی کوئی متاع پائی جارہی ہے وہ دارالعلوم ندوۃ العلما اور اس کے مخلص مردانِ حق کا فیض اور انہیں کے آفتاب علم وعمل کا پرتو ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مختصر تحریر مفکر اسلامؒ کے داعیانہ مزاج، نئی نسل سے وابستہ ان کی امیدوں اور قیادت کے خلا کو پر کرنے کی راہ میں ان کے صحیح نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے، اور نوجوانوں کو اپنا بھولا ہوا مقام یاد دلانے اور کائنات، انسان اور زندگی کے بارے ان کے رویے اور ان کے مثبت کردار کو بروئے کار لانے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوسکتی ہے، خاص طور سے اس دور میں جب کہ نوجوان عام طور سے بے حسی کا شکار ہیں اور اپنے چھپے ہوئے طاقت کے خزانوں سے غافل ہیں اور اپنے بیش قیمت وقت کو نہایت بے دردی کے ساتھ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں مفکر اسلام کے خیالات اور ان کے بے چین دل کی کیفیات ان کو صحیح راستے کی طرف واپس ہونے اور اپنے قائدانہ مقام کی طرف لوٹنے میں بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوسکتی ہیں، اور ان کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے اور ماضی کی غلطیوں کی تلافی کرنے اور ''نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز'' کی عملی تفسیر پیش کرنے میں ان کا کردار بہت بلند ہوسکتا۔ ☆☆☆

ہندوستانی حکمرانوں سے ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی اصلاحی ودعوتی مراسلت وملاقاتیں

مولانا جمال عارف ندویؔ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی ، دعوتی اور اصلاحی خدمات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ماضی قریب میں ایسی تمام تر کوششیں کسی ایک شخصیت میں جمع نہیں ہوسکیں ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح و تجدید کی محنتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ۲۰ رویں صدی میں آپ کا بطور خاص انتخاب فرمایا تھا۔اس کے لیے جن صلاحیتوں اور استعداد ، اسباب و وسائل اور مواقع وامکانات کی ضرورت ہوسکتی تھی اللہ تعالیٰ نے سب کچھ حضرت مولانا کو عطا فرمایا تھا، ان سب کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ نے دعوت واصلاح کے اس خوشگوار فریضے کو بحسن وخوبی انجام دیا۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ۷۰ رسالہ دعوتی زندگی میں معاشرے کا کوئی ایسا طبقہ باقی نہ رہا جس کی دینی رہنمائی واصلاح کی کوشش آپ نے نہ کی ہو۔ان ہی خدمات جلیلہ میں ایک روشن باب وقت کے حکمرانوں کی دینی رہنمائی واصلاح کا کام بھی آتا ہے۔

مجددین ومصلحین کی تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جن میں انہوں نے معاشرے کے مختلف طبقات کی اصلاح کی کوششوں کے ساتھ ساتھ برسر اقتدار طبقہ اور وقت کے حکمرانوں کی اصلاح ورہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ اس کے لیے اس طبقے کے لوگوں سے ملاقات ومراسلت دونوں ہی سے کام لیا ہے۔

سید التابعین حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفۂ وقت یزید بن عبدالملک کا احتساب کیا اور کئی موقعوں پر اس کی غلطیوں پر متنبہ کیا۔امام مالکؒ نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کو بڑا مفصل خط بھیجا جس میں اس کی پوری رہنمائی فرمائی۔امام احمد بن حنبلؒ عباسی خلفا مامون ومعتصم کے زمانے میں ''فتنۂ خلق قرآن'' کے موقع پر دین حق کے لیے سینہ سپر ہوگئے اور پوری عزیمت کے ساتھ مسلک حق پر قائم رہے۔ اس کے لیے خلیفہ وقت کو مسلک حق کی تلقین کرتے رہے۔ متوکل کے زمانے میں اس کو مشورہ دیتے رہے اور اس کے اصرار پر کئی روز لشکر میں قیام فرمایا اور اس میں دینی روح اور اسلامی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔امام غزالیؒ کو سلطان سنجر سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں اس کو ٹوکا اور اس کے بڑے بھائی محمد کو جو اپنے وقت کا سب سے بڑا حاکم تھا ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ

داریوں، خوف خدا اور اصلاح ملک کی طرف متوجہ کیا۔اسی طرح سلاطین سلجوقیہ کے وزرا کو بھی مفصل خطوط اور ہدایت نامے ارسال فرمائے۔حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ عامۃ المسلمین کے ساتھ ساتھ خلفاء وقت اور وزراء وسلاطین سب کے درمیان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے۔سلسلہ نقشبندیہ ہے کہ امام حضرت خواجہ عبداللہ احرار بھی اپنے وقت کے سلاطین و امراء کی رہنمائی فرماتے رہے جس کی شہادت حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے مکتوب میں اس طرح دی ہے۔

''آپ بادشاہوں کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع ومنقاد بنا لیتے تھے۔پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے۔''

''ان ہی مجددین و مصلحین کی فہرست میں امام ابن تیمیہ اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام کا نام بھی شامل ہے۔اور الذکر نے تاتاریوں کے بادشاہ قازان سے براہ راست ملاقات کر کے ایسے حکیمانہ انداز سے گفتگو کی کہ بادشاہ متاثر ہوا اور اس نے بڑی تعداد میں مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دیا اور ثانی الذکر تاتاری حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطان الملک الاشرف اور الملک الظاہر بیبرس کو آمادہ کیا اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو تاتاریوں اور صلیبیوں پر متعدد فتوحات حاصل ہوئیں۔

ہندوستان کے علماء ومشائخ اور مصلحین ومجددین بھی اپنے اپنے دور میں اس فریضہ کو انجام دیتے رہے۔اس باب میں سب سے نمایاں نام گیارہویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی کا ہے جنہوں نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ مغلیہ سلطنت کی چول بٹھانے کا کام کیا اور اکبر کے الحاد و زندقہ کے نتیجہ میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا آہستہ آہستہ اس کی اصلاح کی۔حضرت مجددؒ کی ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جہانگیر کی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے بعد شاہ جہاں زیب آرائے سلطنت ہوا جو فرائض شرعی کا پابند تھا اور اس کے بعد اورنگ زیب جیسا بادشاہ تخت پر بیٹھا جس کو سادس الخلفاء الراشدین کہا گیا۔حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ معصوم اور پوتے خواجہ سیف الدین نے اورنگ زیبؒ کی براہ راست اصلاح وتربیت کی تھی۔

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے دور میں اس فریضہ سے غافل نہ رہے۔انہوں نے بھی روبہ زوال سلطنت مغلیہ کو ممکن حد تک تقویت واصلاح کا سامان بہم پہنچایا۔نواب نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کو خاص طور پر اپنی مکاتبت ومراسلت کے ذریعہ رہنمائی فرماتے رہے۔

(دعوت فکر وعمل)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی سلسلہ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ان مصلحین و مجددین کا رنگ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں سرایت کیے ہوئے تھا۔حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''اصحاب اقتدار اور حکومتوں کے ذمہ داران کی اصلاح کے لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سب سے بہتر طریقہ حضرت مجدد الف ثانی کے طریقہ کو

سمجھا کرتے تھے۔تعلیم وتربیتی نظام کے معاملہ میں انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ کار سے رہنمائی حاصل کی تھی۔متوازن دینی فکر اختیار کرنے میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگردوں سے استفادہ کیا اور اصلاح عوام کے طریقہ کار میں حضرت حسن بصریؒ اور علامہ ابن الجوزیؒ کے انداز کی پیروی کی۔''

(بحوالہ عہد ساز شخصیت ص ۱۳۷)

حکمرانوں سے ملاقاتیں اور ربط و تعلق میں حضرت مولانا کا اصول

معاشرے کے مختلف طبقات کی اصلاح میں سب سے مشکل اور نازک کام امراء ووزراء اور وقت کے حکمرانوں کی اصلاح کا کام ہے۔ یہ وہ میدان ہے کہ جس میں سب سے زیادہ اس بات کا امکان واندیشہ ہوتا ہے کہ حکمرانوں سے ربط و تعلق سے ذاتی فوائد حاصل کیے جانے لگیں۔حکومت کے رعب ودبدبہ اور مالی دولت کی فراوانی سے خود داعی و مصلح کی آنکھیں چکا چوند ہونے لگے اور اس میں کسی درجہ میں مداہنت پیدا ہوجائے۔حدیث پاک میں اسی لیے حکمرانوں سے کثرت سے میل جول، بے تکلف گفتگو، حد درجہ کی قربت اور ہر وقت کی ہم نشینی سے منع کیا گیا ہے۔

جن علماء ومشائخ نے اس وادی خاردار میں پورے اخلاص واستغنا اور شان بے نیازی کے ساتھ قدم رکھا وہ فائز المرام ہوئے اور اس کے بہترین نتائج وثمرات ظاہر ہوئے اور جہاں اس سرمایہ اخلاص واستغنا میں کمی واقع ہوئی وہاں نتائج اس کے برعکس ہوئے۔علماء ومشائخ حکمرانوں کے حاشیہ بردار بن گیے ،اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے اور ان کے ظلم و استبداد کو جائز وروا ٹھہرانے والے بن گیے۔اکبر کے درباری علما میں اس کی لمبی فہرست موجود ہے۔

اس میدان میں کام کرنے والے ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر بنیادی طور پر زہد واستغنا کی صفت ہو۔وہ حقائق پر گہری نظر رکھنے والا اور حکمت وتدبر سے کام لینے والا ہو۔ساتھ ہی گفتگو کا سلیقہ رکھنے والا اور زبان و ادب کا رمز شناس ہو۔انسانیت کے لیے کڑھنے اور گھلنے والا دل رکھتا ہو،اس کی سیرت واخلاق نبوی سیرت واخلاق کا پرتو ہو۔مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے حکمرانوں سے ملاقاتیں اور ربط وتعلق کے سلسلہ میں کچھ اصول متعین فرمالیے تھے جس نے ان کی اس دعوت کے اندر بلا کی تاثیر پیدا کردی تھی۔حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے قلم گہربار سے اس پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا نے اس سلسلہ میں حسب ذیل اصول متعین کرلیے تھے کہ وہ:

(۱) بڑے سے بڑے مواقع کے باوجود اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے لیے اپنا کوئی حق طلب نہیں کریں گے۔

(۲) حکمرانوں سے ملاقات یا مراسلت کے وقت کسی فائدے کے حصول کے لیے کوئی سفارش بھی نہیں کریں گے۔

(۳) اس طبقہ سے کوئی مالی منفعت خواہ ہدیہ کے طور پر ہی کیوں نہ ہو قبول نہیں کریں گے۔

(۴) سرکاری اعزاز وعہدوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ احتراز کریں گے۔

چنانچہ اس فریضہ کی انجام دہی میں آپ پوری زندگی میں سختی کے ساتھ ان اصولوں پر کاربند رہے۔ جن لوگوں کو حضرت مولاناؒ کی زندگی میں تکیہ رائے بریلی جانے کا موقع ملا ہے۔ وہ اس بات کی گواہی دیں گے "کہاروں کے اڈے" سے "تکیہ" تک جانے والی انتہائی تنگ ومخدوش راستوں کی مرمت اور دائرہ شاہ علم اللہؒ میں بجلی اور ٹیلی فون لائن کی فراہمی تک کا مطالبہ حضرت مولانا نے نہیں کیا جو اصلاً حکومت ہی کے کرنے کے کام ہوتے ہیں، جب کہ ان راہوں سے گزرنے والے اور اس کوچے میں قدم رکھنے والے بڑے بڑے سرکاری درباری لوگ اور عرب علماء بھی ہوا کرتے تھے۔ اپنے لیے نہیں تو کم از کم ان کے لیے یہ مطالبے کیے جاسکتے تھے لیکن حضرت مولانا نے پوری زندگی ایسا کچھ نہیں کیا۔

امراء وملوک ان کے در پر آئے، شاہوں کے محلات میں تشریف آوری کی درخواست خود قبول فرمائی مگر استغنا کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ سونے کی اشرفیوں سے بھری تھیلی سمیت متعدد گرانقدر ہدایا و تحفے واپس لوٹائے۔ ہندوستان کے وزرائے اعظم نے پدم بھوشن کا ایوارڈ بہ اصرار دینا چاہا لیکن آپ نے ہر بار انکار فرمایا۔

حکمرانوں کو مخاطب بنانے میں مولانا کا سلوب!

حکمرانوں سے اپنی بات کہنے کا انداز حضرت مولانا کا ناصحانہ اور عاقلانہ ہوتا تھا۔ طرز مخاطبت میں آپ کبھی اپنے عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ خود مخاطب کی اور پوری انسانیت کی بہی خواہی کو ہر موقع پر ملحوظ رکھتے تھے۔ بات پوری وضاحت اور صفائی کے ساتھ رکھتے۔ البتہ بات کہنے سے پہلے مخاطب کے دل میں اپنی جگہ بناتے تاکہ بات دل سے نکل کر دل تک پہنچے اور ملاقاتیں ومراسلت مؤثر ثابت ہوں۔ اس کے لیے آپ پہلے مخاطب کی خوبیوں کا اعتراف فرماتے اور اس کے لیے اپنی خداداد بصیرت سے مخاطب کی بہت سی وہ خوبیاں تلاش کر لیتے جن کی طرف عام طور پر لوگوں کی نگاہ نہیں جاتی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"کسی تحریر کے مضمون پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ مخاطب یا مکتوب الیہ کو نفسیاتی طور پر ایسی غذا بہم پہنچائی جائے جو اس کو یہ احساس دلائے کہ تحریر یا گفتگو میں جائز حد تک مخاطب کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے، اس کی محنت اور کوشش کا اعتراف ہے اور اس سے کسی مایوسی یا بدگمانی کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔"

(کاروان زندگی جلد دوم ص ۲۱۵)

حضرت مولانا نے اس اسلوب دعوت کو ہر جگہ استعمال فرمایا اور اس کے نتیجے میں ان کی دعوت بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ ملک کے وزراء اعظم کے نام خطوط میں اور اپنی گفتگو میں حضرت مولاناؒ نے یہی طرز اختیار کیا۔

ہندوستان کے وزرائے اعظم سے حضرت مولاناؒ کی ملاقاتیں و مراسلت

حکمرانوں کے طبقے میں حضرت مولاناؒ کی دعوتی و

اصلاحی کوششوں کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہندوستان کے علاوہ پورا عالم عرب آپ کی خدمت کا میدان تھا ۔اپنے عہد کے تقریباً تمام اسلامی ممالک کے سربراہوں سے آپ کی دعوتی ملاقاتیں اور اصلاحی مراسلت رہی ہے۔شاہان عرب کو جو مفصل ومختصر خطوط آپ نے ارسال کئے تھے وہ کتابی شکل میں جمع کردئے گئے ہیں اور ملاقاتوں کی تفصیل ''کاروان زندگی'' کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔

عالم عرب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی حکمرانوں کو بھی بروقت رہنمائی کرنے اور انہیں حقائق سے آگاہ کرکے مناسب اقدام کرنے کی مستقل جدو جہد حضرت مولانا کرتے رہے، اس معاملے میں آپ کا کوئی شریک وسہیم نظر نہیں آتا ۔اس میدان میں ہندوستانی وزراء اعظم سے ملاقاتیں اور ان سے مراسلت حضرت مولانا کی اصلاحی خدمات کا ایک مستقل باب ہے۔ ہندوستان میں جب بھی کوئی نیا وزیر اعظم منتخب ہوتا تو حضرت مولانا اسے مبارکبادی کے ساتھ ایک مفصل ناصحانہ خط ارسال فرماتے جس میں ملک کے حالات سے آگاہ کرکے انہیں اپنی ذمہ داریوں کو یاد دلاتے۔

حضرت مولانا کی زندگی میں ہندوستان میں ۱۴ وزراء اعظم ہوئے جن میں بعضوں کی مدتِ وزارت انتہائی مختصر تھی۔حضرت مولاناؒ کی ملک کے اکثر وزرائے اعظم سے ملاقاتیں ومراسلت رہی ہیں۔

☆ مسٹر جواہر لال نہرو :

مسٹر جواہر لال نہرو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم ہوئے۔ ان سے حضرت مولانا کی باقاعدہ مراسلت یا ملاقات وگفتگو کا تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ مصر کے صدر جمال عبد الناصر کی تحریک قومیت عربیہ کے سلسلے میں حضرت مولانا نے جو مبنی برحق وانصاف موقف اختیار کیا تھا جس کو بعض لوگوں نے صدر ناصر کی مخالفت پر محمول کیا تھا۔اس سلسلے میں جواہر لال نہرو نے حضرت مولانا کو بدر الدین طیب جی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے واسطے سے یہ پیغام کہلوایا تھا کہ ''مولانا، ناصر کی مخالفت نہ کریں، وہ ملک سے اور خود ان سے (نہرو جی سے) اچھا تعلق رکھتے ہیں۔''

اس کے جواب میں حضرت مولانا نے طیب جی سے فرمایا تھا کہ ''یہ ہمارے قلب وضمیر کا مسئلہ ہے۔نہرو جی کو اس سلسلے میں صحیح بات سے واقف کرادیا جائے۔'' (دعوت فکر وعمل ص)

☆ مسز اندرا گاندھی :

مسز اندرا گاندھی ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۷ء تک، اور ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک ملک کی وزیر اعظم رہیں۔نہرو کے بعد سے سب سے زیادہ مدت تک وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز رہنے کا انہیں موقع ملا۔اس مدت میں مسز گاندھی سے حضرت کی ملاقاتیں بھی رہیں، مراسلت بھی اور وہ خود بھی حضرت مولانا سے ملنے کے لئے تکیہ آئیں۔ان ملاقاتوں اور مراسلت میں حضرت مولانا نے اپنے داعیانہ مزاج کے مطابق ملک کی صحیح صورت حال سے آگاہ کرکے صحیح سمت میں قدم اٹھانے کی طرف وزیر اعظم کی رہنمائی کی۔یہ ملاقاتیں ناصحانہ بھی تھیں اور جرأت مندانہ بھی۔اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:

۲۵ رجون ۱۹۷۵ء کو ایک خاص پس منظر میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی۔

جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر ملک میں گرفتاریاں ہوئیں، بہت سے اہم مسلم قائدین بھی گرفتار کر لیے گیے۔ مسز گاندھی کے چھوٹے بیٹے مسٹر سنجے گاندھی جو پہلے ہی سے سرگرم تھے اس کے بعد سب سے زیادہ با اختیار شخصیت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ ان کے سامنے صرف دو کام تھے۔ آبادی پر روک لگانا اور اس کے لیے نس بندی کا سلسلہ وسیع کرنا۔ دوسرے شہروں کی صفائی اور آراستگی، اس کے لیے مکانات منہدم کرنا اور بے دریغ بلڈوزر چلوانا۔ زیادہ تر اس کا نشانہ مسلمان بن رہے تھے۔ ان کی کارروائیوں کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔ اندرا گاندھی کے سامنے اگر کوئی شکایت بھی کی جاتی تو وہ کہتیں سنجے گاندھی سے کہو۔ ایک عام دہشت پھیلی ہوئی تھی، لوگ ہراساں تھے۔

جن مسلم قائدین کو گرفتار کر لیا گیا تھا ان میں ایک اہم نام مولانا عبدالغفار صاحب (جماعت اسلامی) کا تھا۔ وہ لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں تھے۔ ۲۸/ دسمبر ۱۹۷۵ء کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان سے ملاقات کے لیے ڈسٹرکٹ جیل تشریف لے گیے۔ اس وقت جیل کے رفا میسٹری احاطہ میں تقریباً ۳۰۰/ سیاسی قیدی تھے۔ مولانا عبدالغفارؒ سے ملاقات کے دوران دوسرے قیدی بھی جمع ہو گیے جو سب ایمرجنسی کے عتاب کا شکار بنے تھے۔ ان میں سے بعض تعلیم یافتہ حضرات نے جن میں بعض غیر مسلم وکلاء بھی پیش پیش تھے، حضرت مولانا سے عرض کیا وہ اگر اس سلسلے میں وزیر اعظم کو متوجہ کریں تو شاید کچھ غور وخوض ہو اور حالات قابو میں آسکیں۔ حضرت مولانا کو بھی حالات کی نزاکت کا پورا احساس تھا اور ملک جس تیزی کے ساتھ کرپشن کی طرف بڑھ رہا تھا اس سے متفکر بھی تھے۔ چنانچہ آپ نے طے کیا کہ اس فریضے کو وہ انجام دیں گے اور اس سلسلے میں جو کچھ ممکن ہو سکے گا کریں گے۔

وہاں سے آنے کے بعد حضرت مولانا نے کئی مرتبہ خط لکھ کر وزیر اعظم سے ملاقات کا وقت مانگا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت مولانا نے اس خیال سے کہ اچانک ملاقات کی صورت نکل آئے ایک مفصل مکتوب تیار کر لیا اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی کروالیا۔ اور یہی ہوا کہ اچانک ۲۳/ اگست ۱۹۷۶ء کو رائے بریلی میں وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ کل آپ راشٹرپتی بھون میں مدعو ہیں۔ آج آپ کی ریل کی سیٹیں ریزرو ہیں۔ آپ کو دہلی چلنا ہے۔

دعوت بالکل اچانک اور فوری ہونے کے ساتھ ساتھ مبہم بھی تھی۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے گفتگو کرنے کے لیے موقع غنیمت جانا اگرچہ کہ اس میں دوسرا خطرہ بھی تھا کہ کہیں گرفتار نہ کر لیا جاؤں، اس لیے کہ ایمرجنسی کے ان حالات میں یہ بعید نہیں تھا۔ حضرت مولانا نے جرأت کا مظاہرہ فرمایا اور اپنے اہل خانہ کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنے کا مشورہ دے دیا اور کچھ وصیتیں بھی کردیں۔ بہر حال اسی شام حضرت مولانا اپنے رفقاء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی و حاجی عبدالرزاق کے ساتھ دہلی تشریف لے گیے۔ حکام کی ہدایت کے مطابق آپ کے لیے فرسٹ کلاس کا ایک کمپارٹمنٹ ریزرو کیا گیا تھا۔ لیکن حضرت مولانا نے اس خصوصی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس وقت کے اپنے معمول کے مطابق تھرڈ کلاس تھری ٹائر میں

سفر کو ترجیح دی ۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صدر موریتانیا کے اعزاز میں ظہرانہ (لنچ) کا اہتمام ہے۔شاید عربوں سے تعلق کی وجہ سے حضرت مولانا کو مدعو کیا گیا تھا۔لنچ میں جب مسز گاندھی سے ملاقات ہوئی تو حضرت مولانا نے اپنا مدعا رکھا کہ میں نے کئی مرتبہ آپ سے گفتگو کا وقت لینا چاہا لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔آپ مجھے اس کے لیے وقت دیں،انہوں نے حضرت مولانا کا نظام سفر دریافت کر کے دوسرے دن دوپہر ۳ر بجے کا وقت ملاقات کے لیے دیا۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر وزیر اعظم کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی ۔حضرت مولانا نے اپنا تیار کردہ مکتوب ان کے سامنے رکھا اور پہلے اسے پڑھ لینے کی گذارش کی ۔اس مکتوب میں حضرت مولانا نے اپنے اسلوب کے مطابق پہلے ان کی بعض خوبیوں کا تذکرہ کیا جس میں ان کی غیر معمولی ذہنی صلاحیت،عزم محکم،قوت فیصلہ اور انتظام ونصرام کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا، پھر بحیثیت وزیر اعظم ان کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا ۔ ایمرجنسی کے نقصانات اور نس بندی کی مہم سے پیدا ہونے والی دلخراش صورت حال کا درد بھرے لہجے میں تذکرہ کیا۔اخیر میں ان سے اچھی توقعات کا اظہار فرمایا۔

وزیر اعظم خط پڑھ چکیں تو حضرت مولانا نے اس کی روشنی میں گفتگو کا آغاز فرمایا۔ایمرجنسی نے سارے ملک میں دہشت کی جو فضا پیدا کردی تھی اس کا نقشہ کھینچا اور اس سے کانگریس کا وقار اور اس کے قائدین کی قربانیوں اور خود ان کی ساکھ کو جو نقصان پہنچ رہا تھا اس ذکر کیا، پھر فرمایا: ''آزادی کی کسی تحریک ، جدو جہد اور اس کے قائدین کی ناکامی کے لیے اس سے بڑی بات نہیں ہوسکتی کہ لوگ غلامی کے زمانے کو یاد کرنے لگیں۔'' یہ فرمایا ''ہم سب کے لیے بڑے شرم کی بات ہے کہ لوگ اب برملا انگریزوں کے زمانے کو یاد کرتے ہیں اور اس کی آرزو کرنے لگے ہیں۔'' پھر بعض معمر مسلمان قائدین کی گرفتاری کا تذکرہ فرمایا اور ان سے متعلق بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کی۔''

دوران گفتگو اندرا جی نے حضرت مولانا سے سوال کیا کہ پھر آبادی کو کس طرح کنٹرول کیا جائے ۔اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ (ایمرجنسی کی) اس کی غیر معتدل (abnormal) فضا کو ختم کیا جائے جس میں کسی مسئلے پر ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے غور کرنا ممکن نہیں۔ پھر اس مسئلے پر ملک کے دانشوروں اور بہی خواہوں کا ایک سیمنار بلایا جائے اور حل تلاش کیا جائے۔

آدھا پون گھنٹہ تک گفتگو کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔اس عرصے میں ان کو بعض اہم اشخاص کی آمد اور ملاقات کے وقت کی اطلاع دی گئی لیکن انہوں نے اشارے سے روک دیا۔اس سے اندازہ ہوا کہ وزیر اعظم نے بھی اس ملاقات کو اہمیت دی۔ اس گفتگو کا اچھا اثر پڑا اور اس کے پانچ ماہ بعد ایمرجنسی کے خاتمہ کا اعلان ہوا۔

۱۹۷۷ء کے الیکشن میں اندرا گاندھی کو اپنے حلقہ رائے بریلی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس کے کچھ عرصہ بعد وہ رائے بریلی کے دورے پر آئیں تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے آپ کی قیام گاہ تکیہ کلاں بھی آئیں ۔ان کے ساتھ کملا ترپاٹھی ،نرائن دت تیواری اور محسنہ قدوائی

صاحبہ بھی تھیں ۔ اس موقع پر بھی حضرت مولانا نے انہیں ملک کے صحیح حالات اور لوگوں کے صحیح جذبات معلوم کر کے ملک کی بے لوث خدمت کرنے کا پیغام دیا۔ محسنہ قدوائی صاحبہ نے کہا کہ آپ اندرا جی کے لیے دعا کیجیے۔ حضرت مولانا نے اپنے خاص اسلوب میں فرمایا کہ میں ہر اس شخص کے لیے دعا کرتا ہوں جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچے اور اس کا بے لوث خدمت گذار ہو۔ حضرت مولانا نے چائے کی پیشکش کی تو انہوں نے کچھ تامل کیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ ''فقیروں کے یہاں کچھ کھائے پیئے بغیر واپس ہونے کا طریقہ نہیں۔'' اس پر انہوں نے منظور کر لیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ اور محسنہ قدوائی گھر کے اندر گئیں تا کہ مستورات کو بھی سلام کریں ۔ کچھ دیر کے بعد پھر اندرا جی کا یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔

۱۹۸۰ء میں کانگریس دوبارہ اقتدار میں آ گئی لیکن اس مرتبہ اندرا جی کے اقتدار میں کانگریس میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں ۔ اس نے ہندو احیائیت کی تحریکوں کو کھلی چھوٹ دے دی، بلکہ در پردہ اس کی سرپرستی بھی کی۔ جس کے نتیجے میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ وشو ہندو پریشد، شیو سینا، آر ایس ایس جیسی فرقہ پرست تحریکات پوری طرح سرگرم عمل ہو گئیں۔ ۱۹۸۴ء میں وشو ہندو پریشد کے ایک خفیہ اجلاس میں مسلمانوں کی اجتماعی ولی نسل کشی کی تجاویز پیش کی گئیں، بابری مسجد، گیان واپی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ کے بارے میں مطالبہ کیا گیا کہ یہ ہندوؤں کے مذہبی مقدس مقامات ہیں جو ہندوؤں کے حوالہ کیے جانے چاہئیں۔ پورے ملک میں مذہبی بغاوت اور فرقہ واریت کا طوفان کھڑا ہو گیا اور مسلمانوں کا تشخص اور ان کی عبادت گاہیں خطرے میں پڑ گئیں۔

اس صورت حال میں حضرت مولانا نے ضروری محسوس کیا کہ ملک کے قائدین اور حکومت کے اہم عہدہ داروں کو خط کے ذریعے سے آئندہ پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا نے اس موقع پر ملک کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نام ایک مفصل اور مؤثر خط لکھا۔

اس خط میں حضرت مولانا نے تین چیزوں کو بہت وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ ایک یہ کہ ملک کی بقا، استحکام و ترقی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے سچے سیکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم محاذ کا راستہ ۔ دوسرے یہ کہ ہندو احیائیت کی تحریک، وشو ہندو پریشد، شیو سینا، آر ایس ایس اور فرقہ پرستی اور جارحیت و تشدد کے کھلے رجحانات کے سلسلے میں رعایت، لچک اور نرمی دراصل ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہے جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی ۔ تیسرے یہ کہ اخلاقی و انتظامی انتشار جو ملک میں اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے اس پر فوری طور پر قابو پانا۔

اخیر میں حضرت مولانا نے پیغام دیا کہ ''تاریخ و تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے بڑی سیاست خلوص ہے، آخر میں اس کی فتح اور اسی کے حامل کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ خلوص ہے جو دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو فدائی بناتا ہے۔ یہی وہ خلوص ہے جس کی ماں کی مامتا میں پیغمبروں اور بے لوث دریشوں کی شفقت میں اور ملک کو آزاد کرانے والے مجاہدین کی بلند نگاہی میں اظہار ہوا ہے اور اب بھی ہندوستان جیسے عظیم ملک کو یہی ''خلوص'' بچا سکتا ہے۔''

مسز اندرا گاندھی کے نام حضرت مولانا کا یہ انتہائی مؤثر اور بڑا طاقتور خط تھا لیکن قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ یہ خط ان تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے محافظین کے ہاتھوں ان کے قتل کا دردناک واقعہ پیش آگیا۔ و کان امر اللہ قدراً مقدوراً۔

☆ مسٹر راجیو گاندھی :

اندرا گاندھی کے بعد ان کے بڑے بیٹے مسٹر راجیو گاندھی ملک کے وزیر اعظم ہوئے۔ ان کا زمانہ وزارت عظمی ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۹ء رہا۔ اسی زمانے میں ''شاہ بانو کیس'' کا قضیہ کھڑا ہوا۔ ۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے نفقہ مطلقہ کے سلسلے میں سابق شوہر کی طرف سے مطلقہ بیوی کو تاحیات یا تا نکاح ثانی نفقہ دینے کا اپنا وہ فیصلہ دیا جس میں دین میں کھلی مداخلت، قرآن مجید کے الفاظ کی من مانی تشریح و تفسیر، شریعت اسلامی کی توہین اور اس پر کھلا حملہ تھا۔ اس نے ملت اسلامیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسئلہ صرف ایک فیصلہ صادر کیے جانے کا نہیں بلکہ شریعت کے تحفظ اور اس ملک میں پرسنل لا پر عمل کی آزادی کا تھا۔ اس لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں کمان سنبھالی اور سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف ایسے عظیم الشان احتجاجی جلسے کیے اور ایسی زبردست دستخطی مہم چلائی کہ پورا ملک ہل گیا۔

ان حالات میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے بار بار ملاقاتوں کا موقع ملا۔ کبھی ارکان بورڈ کے وفد کے ساتھ اور کبھی ذاتی و شخصی طور پر۔

حضرت مولاناؒ نے مسٹر راجیو گاندھی سے پہلی ملاقات ۳۰/جولائی ۱۹۸۵ء کو مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک نمائندہ وفد کے ساتھ فرمائی جس میں وزیر اعظم کو نفقہ مطلقہ متعلق شریعت کے حکم اور بورڈ کے موقف سے آگاہ کیا اور ا فیصلے پر نظر ثانی پر آمادہ کیا۔

دوسری ملاقات ۳/فروری ۱۹۸۶ء کو خود وزیر اعظم کی دعوت پر شخصی طور پر فرمائی۔ جس میں حضرت مولانا راجیو جی کو سمجھایا کہ ''جس طرح رسم الخط (script) کا ایک شارٹ ہینڈ Short Hand ہوتا ہے سیاست (politics) کا بھی ایک شارکٹ ہینڈ یا شارٹ کٹ Shortcut ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جن کا مسئلہ ہے اس کو ان کے مخلص اور مستند لوگوں سے سمجھ لیا جائے۔ قبل اس کے کہ و سیاسی لوگوں (politicians) کے ہاتھوں جانے پائے اور وہ اسے سیاسی مقاصد اور مفادات کے لیے اس کو طوالت دیں، اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔'' (کاروان زندگی جلد سوم ص ۱۳۲) راجیو جی کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے اپنا کام کیا۔

تیسری ملاقات ۱۷/فروری ۱۹۸۶ء کو بورڈ کے جنرل سکریٹری سید منت اللہ رحمانی صاحب کے ساتھ ہوئی۔ اس ملاقات میں پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے نفقہ مطلقہ بل کے مسودہ پر گفتگو ہوئی۔ وزیر اعظم کی فرمائش پر وزیر قانون مسٹر اشوک سین نے تین ورق کا مسودہ نکالا اور دفعہ وار پڑھنا شروع کیا۔ ہر دفعہ پر وزیر اعظم کچھ سوال کرتے، حضرت مولانا اور مولانا منت اللہ رحمانی سے کچھ پوچھتے اور ان کا جواب سن کر وہ اس میں ترمیم کرواتے۔ سوا گھنٹہ میں اس بل کی خواندگی مکمل ہوئی۔

اس ملاقات میں حضرت مولانا نے راجیو گاندھی کو پنا وہ رسالہ پیش کیا جس کا عنوان ''انسانی تہذیب وتمدن پر سلام کے اثرات'' کے نام سے ہے۔ اس میں طبقہ نسواں کے حقوق کے بارے میں مذاہب کا موازنہ اور تاریخ کی روشنی میں تقابلی مطالعہ ہے۔

چوتھی ملاقات مسلم لیڈران اور ممتاز مسلم ممبران پارلیمنٹ کی موجودگی میں ہوئی جو خود وزیراعظم کی دعوت پر تھی۔ حضرت مولانا کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ راجیو جی سے کہا جارہا ہے کہ نفقہ مطلقہ بل کے پیش ہونے اور پاس ہونے سے پہلے مختلف مسلم ممالک کا طرز عمل بھی معلوم کرلیا جائے کہ انہوں نے اپنے یہاں مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں؟ اگر انہوں نے کی ہے تو پھر ایک سیکولر اسٹیٹ کو اس میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ مشورہ قبول کرلیا جاتا تو مسئلہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ اس موقع پر حضرت مولانا نے راجیو جی کو باور کرایا کہ ہندوستان علمی و مذہبی حیثیت سے (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) کسی مسلم یا عرب ملک سے کم نہیں ہے۔ وہ خود اپنا مقام رکھتا ہے۔ اس کو یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں ایسے علما ہیں کہ عالم اسلام میں ان کی یہ اہمیت ہے کہ رابطہ عالم اسلامی جو مسلم ممالک کی سب سے بڑی تنظیم ہے اس میں متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ دنیا بھر کے علما کی رائے الگ رہی اور اس ملک کے عالم کی رائے الگ رہی۔ لیکن فیصلہ اس ملک کے عالم کی رائے کے مطابق ہوا ہے۔ اس لیے اس مسئلے میں کسی اور ملک کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بھی راجیو جی پر اثر کر گئی اور پھر انہوں نے کسی دوسرے ملک کا حوالہ نہیں دیا۔

پانچویں ملاقات ۱۸/ مارچ ۱۹۸۶ء کو وزیراعظم کے دفتر میں ہوئی۔ اس موقع پر جنرل سکریٹری بورڈ کے علاوہ ماہر قانون ایڈوکیٹ عبدالرحیم قریشی صاحب، سکریٹری بورڈ بھی ساتھ تھے۔ اس ملاقات میں وزیراعظم کی موجودگی میں نفقہ مطلقہ بل کو دوبارہ سنا گیا اور اس سے اتفاق ظاہر کیا گیا۔

چھٹی ملاقات ۲۲/ اپریل ۱۹۸۶ء کو بعض فاضل ارکان بورڈ اور قانون داں ممبران پارلیمنٹ کے ذریعہ نفقہ مطلقہ بل میں جو کچھ لفظی ترمیمات کی گئی تھیں اس کا بنیادی حصہ ڈرافٹ اور تائپ کروا کر راجیو جی کو بذات خود پیش کرنے کے لیے فرمائی اور درخواست کی کہ اس ڈرافٹ کی روشنی میں بل کو اور زیادہ مکمل اور منضبط بنا کر پیش کیا جائے۔

ان تمام ملاقاتوں کا راجیو جی پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ ان کا ذہن بالکل صاف ہوگیا اور اس حد تک مطمئن ہو گیے کہ ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''اسلامی قانون ہمارے قانون سے بڑھ کر عورتوں کے حقوق اور مفادات کا ضامن ہے۔'' (کاروان زندگی جلد سوم ص ۱۴۰)

بالآخر وہ وقت آیا کہ ۵/ مئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ میں بل پیش ہوا۔ راجیو جی نے باقاعدہ وہپ (whilp) جاری کردیا تھا کہ تمام ممبران کے لیے حاضر ہونا اور بل کی حمایت میں ووٹ دینا لازم ہوگا، ورنہ ان کی رکنیت ختم کردی جائے گی۔ گیارہ گھنٹے کی طویل اور گرما گرم بحث کے بعد ۵/ اور ۶/ مئی کی درمیانی شب ۲/ بجے ووٹنگ ہوئی اور بل پاس ہوا۔ اور

﴿وکان حقا علینا نصر المؤمنین﴾ کا وعدہ پورا ہوا۔ مسلمانوں میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

یہ بورڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی جس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت وفراست اور حسن تدبیر کا بڑا دخل تھا۔ اس بل کے پاس ہونے کے بعد حضرت مولاناؒ نے راجیو جی کے نام شکریہ کا ایک خط لکھا جس میں اس بل سے متعلق راجیو جی کی ذاتی دلچسپی اور مخلصانہ سعی پر جذبۂ تشکر کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے داعیانہ مزاج کے مطابق حضرت مولانا نے راجیو جی کو ملک کی حفاظت کی خاطر اصول پسندی، اخلاقی جرأت، وسیع النظری اور فراخ دلی کا پیغام دیا۔ ملک میں پنپ رہے ظلم وتشدد کے رجحان، فرقہ واریت اور ذات برادری کا اونچ نیچ، اخلاقی انتشار (corruption) اور فرقہ وارانہ احیائیت (revivalism) کے خلاف صف آرا بلکہ سربکف کھڑے ہونے کی ضرورت کی ترغیب دی اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی استدعا کی۔

☆ مسٹر وی پی سنگھ :

نومبر ۱۹۸۹ء میں جنتا پارٹی اپنی حلیف جماعتوں کے ساتھ برسر اقتدار آئی اور مسٹر وی پی سنگھ ملک کے وزیر اعظم بنے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شیلا نیاس اور رام جنم بھومی کی تحریک اپنے عروج پر تھی جس سے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی فضا عام تھی۔ اس سے قبل بھاگل پور کے خونریز فسادات ہو چکے تھے، جس نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے سخت حالات میں حضرت مولانا نے ضروری محسوس کیا کہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے والے مسٹر وی پی سنگھ کو حقائق اور تاریخ کی روشنی میں ایسے مخلصانہ مشورے دیئے جائیں جن میں ملک وملت کی فلاح ہو اور یہ بتایا جائے کہ نئی حکومت کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہوگا؟ اس کے لیے حضرت مولانا نے ''حکومت کی تبدیلی سے سبق اور آئندہ کے لیے طریقۂ کار'' کے عنوان سے ایک دستاویز مضمون تحریر فرما کر اخبارات و رسائل کو بھیجا اور خاص طور پر اس کا انگریزی ترجمہ کروا کر جناب یونس سلیم صاحب (گورنر صوبہ بہار) کے توسط سے اسے وزیر اعظم کو بھیجا۔

وی پی سنگھ نے پورا مضمون توجہ سے پڑھا۔ اس کے اہم حصوں پر نشانات لگائے۔ پھر حضرت مولانا کو ایک جوابی خط تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ اس مضمون کے اکثر نقاط سے مجھے اتفاق ہے اور ان کے لیے کوشش کی جائے گی۔

اس مضمون میں حضرت مولانا نے پہلے تو حکومت کی تبدیلی کو جمہوریت کی ایک صحت مند علامت قرار دیا اور فرمایا کہ ''کسی سیاسی پارٹی یا قیادت کا بلا ترجیح واستحقاق کے مدت دراز تک منصب قیادت پر فائز رہنا اور ملک کے نظم ونسق پر حاوی وقابض رہنا بہت سی خرابیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ پھر حضرت مولانا نے واضح کیا کہ برسر اقتدار آنے والی پارٹی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس تبدیلی کے اسباب تلاش کرے اور اس سے سبق لے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے ترتیب وار چند حقائق بیان فرمائے اور حکومت پر زور دیا کہ وہ سب سے پہلے ان کی طرف توجہ دے۔

اس ضمن میں حضرت مولانا نے اقلیتوں کی آزادی

وران کے حقوق کے تحفظ پر روشنی ڈالی۔ یک جہتی اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنے پر زور دیا اور اس کی تدابیر بیان فرمائیں۔ نفرت پھیلانے والی جماعتوں اور سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کو ضروری قرار دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ آزادی کے وقت عبادت گاہوں کو جو حیثیت اور شکل حاصل تھی وہ برقرار رکھی جائے اور تاریخ کو الٹا سفر نہ کرایا جائے کہ وہ ایک سویا ہوا شیر ہے جس کو جگانا ہوشمندی کی بات نہیں۔ اخیر میں ملک کی انتظامی ابتری اور فرض شناسی کے خلاف ایک بڑی ملک گیر عوامی جدوجہد اور اخلاقی تحریک برپا کیے جانے پر زور دیا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا نے وی پی سنگھ کے نام نجی خط تحریر فرمایا جس میں ان کو خلوص سے مشورہ دیا کہ ''انہوں نے جتنا حکومت کی تشکیل کے بعد رائے عامہ کے احترام اور اقلیتوں کے تحفظ کے جو اشارے دیئے تھے اور اس سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو حکومت کے ساتھ ہمدردی اور تائید کی ایک فضا قائم ہوئی تھی، اس کو وہ کسی حال میں کمزور و مجروح نہ کریں۔ ساتھ ہی یہ باور کرایا کہ پرسنل لا مسلمانوں کے عقیدے اور نقطۂ نظر سے ان کے مذہب کا ایک جز اور شعبہ ہے۔'' (کاروان زندگی جلد چہارم ص ۲۰۸)

یہ خط ہمدردانہ اور مخلصانہ انداز سے لکھا گیا تھا اور اسے شخصی طور پر ان تک پہنچایا گیا۔

مراسلت کے علاوہ حضرت مولانا کو بابری مسجد رام جنم بھومی کے قضیہ کے سلسلے میں وی پی سنگھ سے ارکان بورڈ علما کے وفد کے ساتھ اور کبھی شخصی ملاقات کا موقع ملا۔ یکم مئی ۱۹۹۰ء کو ارکان بورڈ کے وفد کے ساتھ حضرت مولانا نے وی پی سنگھ سے ملاقات کی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحفظ اور یکساں سول کوڈ کے عدم نفاذ، بابری مسجد سمیت عبادت گاہوں کے تحفظ اور متعدد مطالبات پر مشتمل یادداشت انہیں پیش کی گئی جس پر انہوں نے اتفاق رائے کا اظہار کیا اور اس کی تکمیل کا وعدہ کیا۔ اس ملاقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت مولاناؒ نے ان کی توجہ فرقہ وارانہ فسادات اور تشدد کی طرف مبذول کروائی اور اس سلسلے میں حکومت کی عدم مستعدی پر اپنی فکر مندی کا اظہار فرمایا۔

اسی ملاقات میں وی پی سنگھ نے حضرت مولاناؒ سے کہا ''میں آپ کے مضامین اور تحریریں جو پیام انسانیت کے سلسلے میں ہیں پڑھتا رہتا ہوں، جب کوئی اہم پبلک اسپیچ دینے جانے لگتا ہوں تو آپ کی کوئی تقریر یا رسالہ پڑھ لیتا ہوں۔ آپ نے ایک جگہ بہت صحیح لکھا ہے کہ ''آگ کو جب کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی تو وہ اپنے آپ کو کھانے لگتی ہے۔'' (کاروان زندگی جلد چہارم ص ۲۱۲)

باہمی اعتماد و احترام اور آزاد فضا میں یہ ملاقات اور گفتگو ہوئی اور اگلے ہی دن پریس میں یہ رپورٹ آئی کہ حکومت کا ارادہ مسلم پرسنل لا میں کسی مداخلت کا نہیں ہے۔

وزیر اعظم سے دوسری ملاقات ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو علما کے ایک وفد کے ساتھ ہوئی جس میں زیادہ تر حضرت مولاناؒ ہی کو گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا نے وی پی سنگھ کو مخاطب کر کے کہا:

''اس وقت ہر قیمت پر امن و امان (Laws & order) قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ امن و

امان قائم کرنے کے پیش نظر اور عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنے کی بنا پر کوئی مضبوط قدم اٹھا سکتے ہیں۔'' آگے فرمایا۔ ''اس ملک کے بقا و تحفظ کے لیے تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ۔ (۱) جمہوریت Democracy (۲) نا مذہبیت Secularism اور (۳) عدم تشدد Non-Violence۔ وی پی سنگھ نے ان باتوں سے اتفاق کیا۔ (کاروان زندگی جلد چہارم ص ۳۵۳)

☆ **مسٹر چندر شیکھر:**

جنتا دل اور اسکی حلیف جماعتوں کے داخلی انتشار کے باعث ۱۶ر نومبر ۱۹۹۰ء کو مسٹر وی پی سنگھ وزارت عظمیٰ کے منصب سے سبکدوش کر دیئے گیے اور ان کی جگہ پر مسٹر چندر شیکھر نے وزارت عظمیٰ کا حلف لیا۔ حضرت مولانا نے ان کے پیش رووں کی طرح ان کو بھی خط لکھا اور اس اہم منصب پر فائز ہونے اور ملک کی خدمت، اس کی حفاظت و ترقی کے اس مؤثر ذریعہ اور موقع کے حصول پر مبارکباد پیش کی اور ان ہی الفاظ کو دہرایا کہ ''میں ایک ایسے موقع پر یہ ذمہ داری سنبھال رہا ہوں کہ ملک ''قعر مذلت'' میں گر گیا ہے۔''

اس خط میں ملک کی نازک صورت حال اور اس کی تاریخی آزمائش سے عہدہ برآ ہونے اور ملک کو خطرات سے نکالنے کے لیے حضرت مولانا نے چندر شیکھر جی کے سامنے ۶ر نکات رکھے۔

(۱) انسانی اخلاق اور سچی حب الوطنی کی بنیاد پر عوامی رابطہ Mass contact کی کوشش کی جائے، جس میں فرقہ ورانہ رواداری، احترام انسانیت اور بقاء باہم Co-existance کی اپیل کی جائے۔

(۲) فرقہ وارانہ منافرت کا زہر جو نصابی کتابوں تک میں شامل ہو گیا ہے اس کو نکالا جائے اور بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔

(۳) ذرائع ابلاغ Media کی غیر ذمہ دارانہ روش پر روک لگائی جائے اور میڈیا کا صحیح و مثبت استعمال کیا جائے۔

(۴) پولس کے محکمہ میں اصلاحات کی جائیں، پولس کی انسانی و اخلاقی تربیت کی جائے اور ان میں خدمت و اعانت اور ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا کیا جائے کہ ملک کا ہر باشندہ انہیں اپنا محافظ سمجھے۔

(۵) مسلم پرسنل لا میں کسی بھی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور اس کو پوری طرح محفوظ رکھا جائے۔

(۶) تاریخ کو الٹا سفر نہ کرایا جائے۔ ماضی کے گڑے ہوئے مردوں کو جو صدیوں سے سوئے ہوئے ہیں اکھاڑنے کی کوشش (عبادت گاہوں کی تبدیلی وغیرہ کی شکل میں) نہ کی جائے۔ ورنہ اس سے ملک نئی نئی مشکلات اور غیر ضروری نزاعات میں پڑ جائے گا۔ (کاروان زندگی جلد چہارم ص ۴۰۵)

بابری مسجد رام جنم بھومی قضیہ کے سلسلے میں ایک پر امن و قابل قبول حل کے لیے حضرت مولانا نے بعض مخلصین کی تحریک پر اکثریتی فرقہ کے مذہبی پیشواؤں سے ملاقات و گفتگو کی مسلسل کوشش اور جدوجہد کی تھی۔ حکومت کی بھی منشا تھی کہ یہ مسئلہ دونوں فرقے کے مذہبی پیشواؤں کی آپسی گفتگو اور مصالحت سے حل ہو جائے۔ اس کے لیے چندر شیکھر جی نے

پارلمنٹ میں ایک مصالحتی کمیٹی کی تجویز پیش کی جس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے خود چندر شیکھر جی نے حضرت مولانا رحمہ اللہ علیہ کا نام پیش کیا۔لیکن بعد کے حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ یہ کمیٹی قائم نہ ہوسکی۔

☆ **مسٹر نرسمہاراؤ:**

۱۹۹۱ء کے جنرل الیکشن میں کانگریس پارٹی واضح اکثریت کے ساتھ دوبارہ برسر اقتدار آگئی اور ۱۹ر جون ۱۹۹۱ء کو مسٹر نرسمہا راؤ نے وزارت عظمیٰ کا چارج لیا۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے معمول کے مطابق ان کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اپنے معروضات اور مخلصانہ مشورے دئے۔

اس خط میں حضرت مولانا نے نرسمہاراؤ کو اس اہم منصب پر فائز کیے جانے پر مبارکباد پیش کی اور کہا:''آپ یہ ذمہ داری ایسے موقع پر سنبھال رہے ہیں جب ملک ''قصر مذلت'' میں گر گیا ہے اور اس کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو ملکوں کو کبھی کبھی صدیوں میں پیش آتے ہیں۔''

اس خط میں حضرت مولانا نے جزئی مسائل، اقلیت کی شکایت وضروریات نہیں بلکہ ہندوستان کے عمومی مفاد اور اصولی باتوں پر مشتمل اپنے معروضات کو پیش کیا۔پہلی بات تو یہی فرمائی کہ ملک کی بقا، ترقی، عزت واستحکام کا صحیح محفوظ، باعزت وبے خطر راستہ وہی ہے جو تحریک آزادی کے قائدین کا تھا یعنی سچے سیکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد وعدم و تشدد کا راستہ، پھر فرمایا کہ اس سلسلے میں دو چیزیں فوری توجہ کی مستحق ہیں، ایک ظلم وتشدد کا بڑھتا ہوا رجحان، انسانی جان ومال ،عزت وآبرو کی بے قیمتی، دوسرے انتظامی واخلاقی انتشار، ظلم و تشدد کے رجحانات کی ہمتا کی کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا نے تحریر فرمایا:

''جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت کرنے والا ہے اور مہربان ہے اس عمل سے خوش نہیں ہوسکتا، اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا، اور اس کے نتیجے میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا اور معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا۔لیکن جو لوگ مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتے وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ ظلم وسفاکی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور تہذیبیں جن کا کسی زمانے میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ وادب کے صفحات پر اس کے تابندہ نقوش ہیں، خاتمے اور زوال کا نشانہ بنیں۔

(کاروان زندگی جلد پنجم ص ۴۱)

آگے ملک میں پھیلے ہوئے اخلاقی وانتظامی انتشار کا نقشہ کھینچا اور اس پر اپنی تشویش کا اظہار فرمایا، اخیر میں پھر وہی بات دہرائی کہ تاریخ کو الٹا سفر نہ کرایا جائے، جو مذہب یہاں جس طرح آزادی کے ساتھ باقی ہیں ان کو اسی طرح رہنے دیا جائے، ان کے پرسنل لا کا تحفظ کیا جائے، فرقہ وارانہ نفرت کو ہوا نہ دی جائے ورنہ یہ آگے بڑھتے بڑھتے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، جس سے ملک تباہ ہوجائیگا۔''

نرسمہاراؤ کے نام حضرت مولانا کا یہ پہلا خط تھا، اس کے بعد متعدد مواقع پر ملاقاتوں و مراسلات کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۱ر اگست ۱۹۹۲ء کو حضرت مولانا کی قیام گاہ (مہمان خانہ ندوۃ العلماء) میں نرسمہا راؤ جی کے فرستادہ حضرت مولانا کے نام ان کا ذاتی مکتوب لے کر آئے جو اردو زبان میں خود ان کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔ اس مکتوب میں انہوں نے بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعہ کے بارے میں لکھا کہ

''جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ یہ انتہائی نازک اور حساس مسئلہ بن گیا ہے، اور اس مسئلے کا منصفانہ، معقول اور سب کے لیے قابل قبول حل نکالنے کے لیے ملک کے ممتاز مذہبی رہنماؤں کے مشورے اور عملی تعاون کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔''

اس خط میں وزیر اعظم نے بابری مسجد رام جنم بھومی قضیہ کے سلسلے میں ماضی میں حضرت مولانا کی جو مثبت ومخلصانہ کوششیں تھیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ کے لیے بھی رہنمائی اور تعاون کی امید ظاہر کی۔ اخیر میں لکھا:

مناسب تو یہی تھا کہ آپ سے ملاقات ہوتی تا کہ مسئلے کے تمام پہلوؤں سے گفتگو ہوسکتی، لیکن اگر کسی وجہ سے اس وقت آپ کے لیے دہلی کا سفر ممکن نہ ہو تو براہ کرم اس سلسلے میں آپ مجھے اپنے خط یا اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ اپنی رائے مشورہ یا اس سلسلے میں طریقۂ کار یا عملی حل کے لیے اپنی تجاویز سے مطلع فرمادیں۔ سب کی رائے ہے کہ اس سلسلے میں بلا تاخیر مناسب اقدام کیے جانے چاہئیں، اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔'' (کاروان زندگی جلد پنجم ص)

اس خط کے جواب میں حضرت مولانا نے ملک کے وسیع تر مفادات میں وزیر اعظم سے ملاقات وگفتگو کی ضرورت سے اتفاق کا اظہار کیا اور ملاقات کا وقت مانگا۔

جس دن یہ دستی خط موصول ہوا اس دن حسن اتفاق سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آل انڈیا پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس حضرت مولانا کی ہی صدارت میں جاری تھا۔ ارکان بورڈ بھی وزیر اعظم سے ملاقات ضروری خیال کر رہے تھے۔ اس لیے ارکان بورڈ کا ایک مؤقر وفد تشکیل پایا اور ۱۵ر اگست ۱۹۹۲ء کی دو پہر اس وفد نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں وزیر اعظم سے ملاقات کی۔

اس ملاقات میں حضرت مولانا نے ملک کی نازک صورت حال پر گفتگو کی اور وزیر اعظم سے توقع ظاہر کی کہ وہ اپنی وسیع القلبی اور وسیع النظری کے ساتھ اس مسئلہ کا حل تلاش کریں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ مسجد کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جاسکتی۔ ہندوستان دینی مسائل میں قدیم زمانے سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ یہاں کے علما کی رائے قابل احترام اور ہر طرح سے قابل اعتبار ہے۔ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ مسجد اپنی جگہ سے ہٹائی نہیں جاسکتی اور اس کی جگہ پر کوئی دوسری عمارت نہیں بن سکتی۔ (کاروان زندگی جلد پنجم ص ۱۰۶)

حضرت مولانا کے بعد دیگر معزز ارکان وفد نے بھی گفتگو کی۔ نرسمہا راؤ جی یہ سب خاموشی سے سنتے رہے اور اپنی طرف سے کوئی فارمولا پیش نہیں کیا۔

دوسرے دن وزیر اعظم کے سکریٹری کا حضرت مولاناؒ کو فون آیا کہ وزیر اعظم آپ سے خصوصی ملاقات کرنا چاہتے ہیں، آپ دوبارہ تکلیف کریں۔ حضرت مولاناؒ نے

معذرت کی لیکن دوبارہ سہ بارہ ٹیلیفون آیا اور اصرار بڑھتا رہا یہاں تک کہ حضرت مولانا نے یہ سوچ کر ملاقات کا وعدہ کرلیا کہ ممکن ہے جلد پرسنل لا بورڈ کے وفد کو آپ ہی کی قیادت میں دوبارہ ملنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم نے بلایا تھا اور اصرار کیا تھا جب تو آپ نہیں آئے اب خود ملنا چاہتے ہیں؟ چنانچہ حضرت مولانا نے تنہائی میں یہ خصوصی ملاقات فرمائی اور دوبارہ وہی باتیں کہیں جو پرسنل لا بورڈ کے وفد کی موجودگی میں کہی تھی۔

افسوس کہ مسٹر نرسمہاراؤ ہی کے وزارت عظمیٰ کے دور میں بابری مسجد کے انہدام کی شکل میں ہندوستان کی تاریخ کا عظیم ترین سانحہ پیش آیا اور اس کے بعد ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جس میں مسلمانوں کا شدید جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس پس منظر میں ماہ جنوری ۱۹۹۳ء کی کسی تاریخ میں بعض مخلصین کی تحریک پر حضرت مولانا کی وزیر اعظم سے ملاقات آندھرا پردیش بھون (دہلی) میں رکھی گئی۔ اس ملاقات میں حضرت مولانا کے ساتھ مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور محمد یونس سلیم صاحب (سابق گورنر بہار) بھی موجود تھے۔ اس ملاقات میں حضرت مولانا نے اپنی گفتگو ملک کی موجودہ صورت حال اور مہاراشٹر و گجرات کے فسادات کے دائرے میں محدود رکھی اور صفائی کے ساتھ کہا کہ ''ملک اس وقت جل رہا ہے اور تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس کی جلد خبر لینے کی ضرورت ہے ورنہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

۵/اپریل ۱۹۹۳ء کو حضرت مولانا کی قیادت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارکان وفد نے دوبارہ وزیر اعظم سے بات کی اور ان کی خدمت میں ایک واضح اور مفصل میمورنڈم پیش کیا۔ حضرت مولانا اور ارکان بورڈ نے بھی گفتگو کی لیکن وزیر اعظم نے اظہار خیال اور تاثر میں بہت احتیاط برتی اور کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

۶/دسمبر ۱۹۹۳ء کو حضرت مولانا کی قیادت میں بورڈ کے ارکان عاملہ نے وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ حضرت مولانا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ ''نفسیاتی طور پر خوشی تو جب ہوتی کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے آتے کہ آپ نے مسئلے کو حسب وعدہ حل کرنے کا عزم و بندوبست کرلیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بجائے شکریہ کے خوشگوار فریضے کے ادا کرنے کے ہم شکایت کا کردار ادا کررہے ہیں کہ ابھی تک اس مسئلے میں کچھ نہیں ہوا۔'' دیگر ارکان وفد نے بھی اظہار خیال کیا لیکن جواب میں وزیر اعظم نے نہایت مختصر اور غیر واضح باتیں کہیں جس کے بعد یہ وفد کسی قدر مایوسی کے ساتھ واپس ہوا۔

اس کے بعد حضرت مولانا کی نرسمہاراؤ جی سے کوئی ملاقات و مراسلت نہیں ہوئی۔

☆ مسٹر دیوی گوڑا:

مئی ۱۹۹۶ء کے عام انتخابات کے بعد کسی پارٹی کو واضح اکثریت نہ ملی۔ سب سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنے والی پارٹی بی جے پی کو حکومت بنانے کا موقع دیا گیا۔ اور مسٹر اٹل بہاری واجپائی وزیر اعظم بن گیے لیکن اکثریت ثابت نہ کرسکنے کی وجہ سے صرف ۱۳ دنوں میں سبکدوش ہونا پڑا۔

اس کے بعد ۱۳/جون ۱۹۹۶ء کو متحدہ محاذ کے قائد مسٹر دیوی گوڑا نے پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت ثابت کردی اور

بطور وزیر اعظم ملک کی کمان سنبھال لی۔ وزیر اعظم بننے کے صرف ایک ماہ بعد ۱۳؍ جولائی ۱۹۹۶ء کو وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے دار العلوم ندوۃ العلما تشریف لائے۔ احترام وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مہمان خانہ سے کچھ فاصلے پر جوتے اتارے اور ننگے پاؤں مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ حضرت مولانا کی یہ ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ مسٹر دیوی گوڑا اردو زبان سے بالکل نا آشنا ہیں۔ حضرت مولانا نے ان کی براہ راست بغیر کسی ترجمان کے انگریزی میں بات کی۔ انہیں ملک کی خدمت کی طرف متوجہ کیا، سماج میں اخوت، رواداری اور امن کی ضرورت بتائی اور کہا کہ ہر ایک کو بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے کام کرنا چاہئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر مسٹر دیوی گوڑا رخصت ہوگیے۔

اس کے کچھ دنوں بعد حضرت مولانا نے اپنے معمول کے مطابق وزیر اعظم کو ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں اولاً انہیں اس عظیم منصب پر فائز ہونے پر دلی مبارکباد دی اور ندوہ آنے پر شکریہ ادا کیا۔ پھر اپنے خاص اسلوب کے مطابق حضرت مولانا نے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ کے ہندوستان کی قیادت اور وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالنے پر آپ سے زیادہ ملک مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نازک پر خطر بلکہ مہیب موقع پر کہ یہ عظیم تاریخی ملک اور تہذیبی مرکز، قیادت ورہنمائی اور منصفانہ وحقیقت پسندانہ نظم و نسق اور عدل وانصاف کے لحاظ سے سالہا سال سے لاوارث ہو رہا تھا، اور عظیم خطرے سے دوچار تھا، اس کو ایک وسیع القلب، وسیع الفکر اور حقیقت پسند قائد اور منتظم اعلیٰ حاصل ہوا۔ اس میں آپ کی وہبی خصوصیات اور قابل قدر تجربات کے علاوہ ہماری اور خدا کے بہت سے بندوں کی دعاؤں کو بھی دخل ہے جنہوں نے وطن عزیز کے لیے ایک بہتر اور صالح تر رہنما اور منتظم اعلیٰ کے حاصل ہونے کی دعا کی اور خدا نے اس کو جلد ایک بہتر رہنما اور منتظم اعلیٰ عطا کیا۔" (کاروان زندگی جلد ۶ ص ۲۵۵)

اس کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ملک کی صورت حال واضح فرما کر ان کی ذمہ داری انہیں یاد دلائی۔ مولانا نے فرمایا کہ جس کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور ہوتی ہے اور جو تمام مشکلات پر فتح حاصل کرتی ہے وہ "خلوص" اور "صداقت" ہے، جس سے ناممکن چیزیں ممکن ہوجاتی ہیں اور دشمنیاں دوستی سے بدل جاتی ہیں۔ اس لیے سب سے زیادہ اسی پر عمل کیا جائے اور اس کو فتح وکامیابی کا راز سمجھا جائے۔ (کاروان زندگی جلد ۶ ص ۲۵۶)

اس کے بعد حضرت مولانا نے ان ہی تین بنیادی اصولوں کو ذکر کیا جن پر ملک کی بنیاد ہے یعنی جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد و اتحاد۔ ساتھ ہی حضرت مولانا نے تلقین فرمائی کہ کوئی ایک عائلی قانون سب پر تھوپنے کی کوشش نہ کی جائے، میڈیا اور نشر واشاعت کے ذرائع کو کسی مذہب اور فرقے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے نہ دیا جائے، نصاب تعلیم سے مذہب سے متعلق توہین آمیز مواد نکالا جائے، نیز یہ کہ بابری مسجد کے انہدام میں جو غلطی کی گئی اب اسے دوہرایا نہ جائے۔

☆ **مسٹر اٹل بھاری واجپائی :**

مارچ ۱۹۹۸ء کے جنرل الیکشن میں بی جے پی حکومت برسر اقتدار آئی اور مسٹر اٹل بہاری واجپائی ملک کے وزیر اعظم بنے، اور حضرت مولانا کے مسلسل اندرون ملک اور بعض بیرون ملک کے طویل اسفار ہوتے رہے اور اس کے بعد شدید ضعف و علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے باعث مولانا مسٹر اٹل بہاری واجپائی کو اپنے معمول کے مطابق مکتوب ارسال نہ کر سکے نہ ہی ملاقات کی کوئی تقریب پیدا ہوئی۔

لیکن مسٹر واجپائی جو اگر چہ ایک کٹر ہندو توادی پارٹی کے سربراہ تھے خود حضرت مولانا کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ مارچ ۱۹۹۹ء میں حضرت مولاناؒ پر فالج کا حملہ ہوا اور آپ صاحب فراش ہو گیے۔ نقل و حرکت دشوار ہو گئی۔ اہل تعلق اور معالجین نے علاج و معالجہ میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس علالت اور ناسازی طبع کی اطلاع دور دور تک پہنچی اور اہل تعارف نے اپنے تعلق اور فکر کا اظہار کیا۔ وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری واجپائی نے کئی مرتبہ دہلی آنے کی دعوت دی اور چارٹر پلین بھیجنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ان سے معذرت کر دی گئی۔

۲۸ر مارچ ۱۹۹۹ء کو وزیر اعظم اپنی ایک ٹیم کے ساتھ جس میں وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ، گورنر یوپی سورج بھان، ریاستی صدر بی جے پی راج ناتھ سنگھ اور لال جی ٹنڈن تھے حضرت مولانا کی عیادت کے لیے آئے۔ حضرت مولانا نے اپنی شدید علالت اور ضعف کے باوجود ان حضرات سے لیٹے لیٹے ملاقات کی اور اس عالم میں بھی ایک محب وطن اور ملک کے خیر خواہ کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دیا۔ اپنی وہی اصولی بات دہرائی جو ان کے پیش رو وزرائے اعظم کو کہتے چلے آئے تھے۔ یعنی اس ملک کی بقا و استحکام کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں: جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد۔ اگر ان اصولوں سے انحراف کیا جائے گا تو ملک سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔

حضرت مولانا نے اخیر میں ایک آہ کے ساتھ عرض کیا: ''واجپائی جی! ملک کی فکر کیجئے، یہ ملک لاوارث ہوتا جا رہا ہے۔''

وزیر اعظم اور ان کے رفقا نے ان باتوں کو سکون اور خاموشی سے سنا، تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

یہ حضرت مولانا کی وفات سے ۹ر ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو حضرت مولانا کی وفات حسرت آیات کا سانحہ پیش آیا۔

اختتامیہ:

یہ وہ داستان تھی جو ہندوستانی وزرائے اعظم سے حضرت مولانا کی مراسلت و ملاقاتوں پر مبنی تھی۔ یہ حضرت مولانا کی ان مساعی جلیلہ کا ایک بہت مختصر سا حصہ ہے جو آپ نے وقت کے حکمرانوں اور اصحاب اقتدار کی اصلاح و خیر خواہی، رہنمائی و رہبری کے تعلق سے انجام دی تھی۔ اس لیے کہ خود ہندوستان میں مختلف صوبوں کے وزرائے اعلیٰ و گورنر اور مختلف پارٹیوں کے سربراہوں سے آپ کی ملاقات و مراسلت اس سے ہٹ کر ہے۔ نیز عالم عرب اور بعض دیگر مسلم ممالک کے قائدین اور سربراہوں سے جو آپ کی دعوتی و اصلاحی ملاقات و مراسلت رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ طویل اور ثمر آور ہے۔

☆☆☆☆☆

مفکر اسلامؒ اور ہندوستانی مسلمان، قربانی اور خدمات
''ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ'' کی روشنی میں

مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامعیت کی شان رکھتی تھی، فیاضِ ازل نے ان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، ان کی خدمات کا دائرہ صرف تعلیمی و دعوتی میدانوں میں محدود نہیں ہے، بلکہ تاریخی اور ثقافتی میدانوں میں گہرے نقوش ثبت کر چکے ہیں، تاریخ کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے، اگر تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے تو اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور نسلیں فکری اعتبار سے مردہ ہو جاتی ہیں، اس حقیقت کا احساس حضرت مولاناؒ کے خاندانی بزرگوں اور اسلاف کو شدت سے تھا، اسی لیے انہوں نے موضوع کو اہمیت دی، اور اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے، چاہے وہ حضرت کے دادا مرحوم سید فخر الدین خیالی ہوں یا آپ کے والد گرامی قدر علامہ عبدالحی حسنیؒ، اس موضوع پر دونوں کی گرانقدر خدمات کا زمانہ شاہد ہے۔

اسی موروثی جذبے اور صلاحیت سے ملک ہندوستان جو اُن کا وطن ہے، پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے اثرات، ان کی خدمات، اور کارناموں پر ایک جامع اور مختصر کتاب تحریر فرمائی ہے، جو ''ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ'' کے نام سے معروف ہے، یوں تو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب پر بے شمار کتابیں مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں، پروفیسر مجیب کی انگریزی میں ''اینڈین مسلمس'' پروفیسر عابد حسین کی اردو میں ''ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں'' مصر کے وزیر اوقاف عبدالمنعم النمر کی عربی میں ''تاریخ الاسلام والمسلمین فی الھند'' معروف کتابیں ہیں، ان کے علاوہ بھی بلند پایہ متعدد کتابیں ہیں، جن کا اپنا علمی اور فکری مقام ہے، اور معروف اہل قلم کی لکھی ہوئی ہیں، حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ کی زیر تذکرہ کتاب ''ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ'' ان تمام کتابوں سے الگ ہے، اور اس میں مسلمانوں کی اپنی تہذیبی خصوصیات، ان کے مسائل اور مشکلات، ان کی علمی خدمات اور ان کے اداروں کا تعارف موجود ہے۔

کتاب کی اشاعت کا محرک

ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد برادران وطن کو مسلمانوں کے طرز زندگی، ثقافت، رہن سہن، عبادت اور دیگر ضروری تہذیبی قدروں سے روشناس کرانا ہے، اور ان کے ذہن میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے، کیونکہ یہ بات صرف ناواقفیت تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک پوری کی

پوری قوم کی تہذیب وتاریخ، اس کے گذشتہ کارناموں اور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں اس نے جو مرکزی اور اہم پارٹ ادا کیا ہے اور اس راہ میں جو بیش بہا قربانیاں دی ہیں ،اُن کو نظر انداز کرنے اور اُن کے انکار کرنے کا رجحان پیدا ہو چلا ہے، ہندوستان کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کی ایک منظم کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان کا دور گویا ایک پردیسی قوم کا سامراجی دور تھا، جو ہر طرح کی خوبی اور حسن سے خالی تھا، اُس دور میں کوئی بلند شخصیت، کوئی تمدن اور علمی کارنامہ ملک کی تعمیر و ترقی کا کوئی بے لوث اور بے داغ کام نہیں ہوا، جس پر ہندوستان کو فخر کرنے کا موقع ہو، آزادی کی طویل جنگ میں اُس کی حیثیت محض تماشائی اور غیر متعلق فریق کی تھی اور اگر اس نے کہیں اتفاقاً حصہ لیا تو اس کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں، اِس طرح ہم ہندوستان کے ہرے بھرے اور سدا بہار درخت کی ایک ثمر دار شاخ پر تیشہ چلا رہے ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ آٹھ سو، ہزار برس تک یہ درخت بے فیض اور بے ثمر رہا، اور اِس ملک میں خزاں کا دور دورہ رہا، یہ واقعہ تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے اور اس سے ہمارے ملک کی زرخیزی اور مردم خیزی میں اور اس کی فطری صلاحیت پر بھی حرف آتا ہے، اس طرح ہم نہ صرف یہ کہ کروڑوں کی تعداد میں بسنے والی ایک قوم کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور اس کی دل آزاری کرتے ہیں اور اس کی امنگوں پر اوس ڈالتے ہیں، بلکہ اس ملک، اس کی تاریخ اور اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں، جن کو اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اس دور کی ممتاز اور قابل قدر شخصیتوں کا نمونہ ان کے سامنے لایا جائے ،اِسی ضرورت و حقیقت کا احساس اس کتاب کی اشاعت کا محرک ہے۔

ملک کے عظیم معمار

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان نہ صرف ملک کے آزاد باعزت شہری اور قدیم باشندے ہیں، بلکہ اس عظیم ملک کے معمار ہیں، انہوں نے اس ملک کی خدمت کی، اس کا پایہ بلند کیا ،اس کے تمدن اور ذہن کو نئی زندگی اور وسعت عطا کی، اس کو نئی دینی اور اخلاقی قدروں سے روشناس کیا، اس کے چمن کو نئے سلیقے سے سنوارا، ان کا پایہ سب سے بلند ہے، یہاں کی خاک کے ذرہ ذرہ پر ان کی عظمت کا نقش اور اس ملک کے چپہ چپہ پر ان کی ذہانت اور ان کے خلوص اور ان کے ذوق تعمیر اور جذبہ خدمت کی یادگاریں ہیں، یہاں زندگی اور تہذیب کا ہر گوشہ ان کے ذوق لطیف اور مذاق سلیم کی شہادت دیتا ہے، ہندوستان کی سرزمین پر جو شخص بھی قدم رکھے گا اور یہاں کی تاریخ کی جو بھی ورق گردانی کرے گا، وہ بے اختیار پکار اٹھے گا:

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

مسائل ومشکلات کا تذکرہ

حضرت مولانا نے مسلمانوں کی مشکلات اور ان کی شکایات کا عنوان بھی قائم کیا ہے، اور ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن اس طرح کہ وطن اور برادران وطن سے کہیں نفرت کا اظہار نہیں ہوتا ہے، ملکوں کی تاریخ میں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں لہذا ایسے موقع پر باہمی اتحاد واعتماد کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور فرقہ وارانہ مسئلے کو عقل مندی و ہوشمندی کے ساتھ حل کرنا چاہیے، حضرت مولاناؒ نے اس کتاب

کے ذریعے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کا وقار بلند کیا ہے ، انہوں نے صرف گفتار اور اشہب خامہ کی رفتار سے ہندوستان کا تعارف نہیں پیش کیا، بلکہ اپنے کردار اور طبع خوددار کے ذریعے پورے ہندوستان کا سر بلند کیا ہے،مولانا کی شخصیت چمن کے ان خوددار کانٹوں کی طرح تھی، جو شبنم کے لیے دامن کو پھیلایا نہیں کرتے ،سونے کے ڈلے ان کے لیے خزف ریزوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے،مولانا کے قلم سے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کتاب اس قائد کی کتاب معلوم ہوتی ہے، جسے اپنی قوم کی کمزوریاں تو معلوم ہیں،لیکن اس کی خوبیاں بھی معلوم ہیں،ان خوبیوں کو اس لیے اجاگر کرنا ہے کہ قوم کو اپنی صلاحیتوں کے بارے میں اعتماد پیدا ہو،اور کمزوریوں کا تذکرہ اگر کرنا ہے تو اس انداز سے کرنا ہے کہ اپنی اصلاح کا جذبہ پیدا ہو ، وہ نہ تو مایوس ہوجائے اور نہ شکستہ خاطر ہو ، کتاب میں مسلمانوں کا تذکرہ زیادہ ملے گا، کیونکہ کتاب بیرون ممالک میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعارف کے طور پر لکھی گئی ہے،اور بہت جامع اور باوقار تعارف ہے،ایک مسلمان مصلح ،قائد کے شایان شان ہے ، یہ واحد کتاب ہے ،جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب پر مسلمانوں کے کیا احسانات ہیں ،عربی اور اسلامی علوم کی یہاں مسلمانوں نے کیسی خدمات انجام دی ہیں،اور عقیدۂ توحید کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کیا۔

توحید اور خدا پرستی کا عطیہ

سب سے بیش قیمت اور نادر تحفہ جو مسلمان یہاں لائے ،وہ اسلام کا خالص اور بے میل عقیدۂ توحید تھا،جس کے تحت عبد و معبود کے درمیان دعا و عبادت کے لیے کسی درمیانی ہستی کی ضرورت نہیں ، اس عقیدۂ توحید میں تعدد الٰہ خدا کے نظریہ یا سایہ کے تصور اور حلول واتحاد کے عقیدہ ونظریہ کی گنجائش نہیں ، بلکہ خدائے واحد و بے نیاز کی الوہیت اور وحدانیت کا اعتراف و اقرار ہے ، جس کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ باپ ،اور نہ خدائی میں کوئی اس کا شریک ،کائنات کی خلقت و پیدائش ، دنیا کا نظم ونسق اور زمین و آسمان کا اقتدار اعلی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ہندو تہذیب اور ہندو مذہب پر اسلام کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور فاضل و مورخ ڈاکٹر کے ایم پانیکر لکھتے ہیں:

> ''یہ بات تو واضح ہے کہ اس عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا ، ہندوؤں میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا،اور اس زمانے کے تمام ہندو پیشواؤں نے اپنے دیوتاؤں کا نام چاہے کچھ بھی رکھا ہو،خدا پرستی ہی کی تعلیم دی،خدا ایک ہے، وہی عبادت کے لائق ہے،اور اسی کے ذریعے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔(بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک:ص ۳۵۰)

اسلامی اخوت ومساوات کا تحفہ:

اجتماعی زندگی میں ہندوستان کے لیے سب سے نئی اور قیمتی چیز اسلامی اخوت ومساوات کا تصور تھا،مسلمانوں کے یہاں نہ تو طبقاتی اونچ نیچ تھی اور نہ اچھوت نام کی کوئی قوم تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی شخص جنم کا ناپاک اور جاہل نہیں ہوتا کہ جس کو حصول علم کا حق نہ ہو،کسی پیشے یا صنعت کے لیے کوئی

ذات خاص نہ تھی، بلکہ ایک ساتھ رہتے تھے، کھاتے پیتے تھے اور امیر و غریب سب پہلو بہ پہلو حصول علم کی کوشش کرتے تھے، ہر شخص کو حق تھا کہ جو پیشہ چاہے اختیار کرے، اس موقع پر حضرت مولانا نے پنڈت جواہر لال نہرو کا اقتباس نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تاریخی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور اسلام کی آمد ہندوستان میں کافی اہمیت رکھتی ہے، اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی تھیں، ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا، اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا، خصوصا وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے، اس سے بہت متاثر ہوئے۔"

(بحوالہ تلاش ہند ص ۵۲۵، ۵۲۶)

(ترجمہ Discovery of india)

عورت کے حقوق اور بعض رسوم کی اصلاح

تیسرا تحفہ جو مسلمان اس ملک کے لیے لائے وہ عورت کی عزت اور خاندان انسانی کے ایک باعزت فرد اور مرد کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے اس کا تعارف تھا، ایک ایسے ملک میں جہاں شریف عورتیں شوہروں کی موت پر "ستی" ہو جاتی تھیں، کیونکہ سماج اور خود ان کی نظر میں شوہر کے بعد انہیں زندہ رہنے کا حق ہی نہیں تھا، اسلام کے بخشے ہوئے صنف نازک کے حقوق کی جو اہمیت ہو سکتی تھی وہ محتاج بیان نہیں، ستی کی مہیب اور لرزہ خیز رسم کی اصلاح میں بھی مسلمان سلاطین اور اہل حکومت نے ممکن حصہ لیا۔ (ہندوستان کے مذہبی عقائد اور رسوم کے احترام کی رعایت کے ساتھ) پہلے کی نسبت مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے:

"آج کل "ستی" کی تعداد کم ہوگئی ہے، کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرمانروا ہیں، اس وحشیانہ رسم کو نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں، اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر نہیں ہے، کیونکہ ان کی پالیسی "تدبیر مملکت" کا وہ جز ہے کہ ہندوؤں کے معاملے میں دست درازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے، بلکہ قومی رسوم کو ادا کرنے میں ان کو آزادی دیتے ہیں، تاہم ستی کی رسم و رواج کو دوسرے انداز سے روکتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہو سکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا، جب تک واقعی طور پر اس امر کا یقین ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گی، صوبہ دار بیوہ کو بحث و مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے کرتا ہے، اگر اس کی فہمائش اور تدبیر کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا کرتا ہے کہ محل سرا اُس کو بھیج دیتا ہے، تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں، مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی رسم اب بھی قائم ہے، خصوصا ان راجاؤں کے علاقوں

اور عمل داریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار نہیں ہے"۔ (بحوالہ وقائع سیرت وسیاحت Tranel in mughal empire از: ڈاکٹر برنیر ترجمہ جلد دوم ص ۱۷۲)

فن تاریخ

مسلمانوں نے بہت سے جدید علوم بھی ہندوستان میں منتقل کیے، ان علوم میں تاریخ کا فن بہت اہم ہے، کیونکہ اس وقت تک اس فن میں یہ ملک بہت تہی دست تھا، یہاں کوئی کتاب تاریخ کی کتاب کہلانے کی مستحق نہیں تھی، بلکہ صرف مذہبی نوشتے، رزمیہ قصائد اور مہابھارت ورامائن کے نسخے ملتے تھے، مسلمانوں نے فن تاریخ میں مستقل کتب خانہ تیار کردیا، جس کا شمار تاریخ کے وسیع کتب خانوں میں کیا جاسکتا ہے، جو کسی ملک میں وجود میں آئے۔

ڈاکٹر گستاؤ لی بان اپنی کتاب "تمدن ہند" میں لکھتا ہے: "قدیم ہند کی کوئی تاریخ نہیں ہے، ان کی کتابوں میں مطلقاً تاریخی واقعات درج نہیں ہیں"۔

پھر یہ لکھنے کے بعد کہ وید اور مہابھارت سے کسی قدر اس ملک کے حالات پر روشنی پڑتی ہے کہتا ہے:

"ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا اور ہندوستان کا پہلا مؤرخ مسلمان ہیں۔ (بحوالہ "تمدن ہند کتاب سوم ہندوستان کی تاریخ ص ۱۴۶)"۔

نئے اسالیب

ہندوستان کو مسلمانوں سے عمومی طور پر وسعت خیالی، ندرت فکر اور شعر وادب کے نئے اسالیب ملے، نیا زاویۂ نگاہ، نیا انداز فکر بغیر عقلی اور ادبی فکری امتزاج کے ناممکن تھا، دوسرے تحائف اور اضافوں کے ساتھ جو مسلمانوں نے ہندوستانی تہذیب میں کیے، مسلمانوں نے اس ملک کو ایک نہایت حسین اور وسیع زبان دی، جو ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان تبادلۂ خیال کا ذریعہ اور علم وادب کی زبان قرار پائی، اس سے مراد اردو ہے جس کی وسعت اور شیرینی محتاج تعارف نہیں، قدیم ہندوستان کی تصویر بابر کے قلم سے: بابر اپنی "توزک" میں لکھتا ہے:

"ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور، پیتا نہیں، برف نہیں، آب سرد نہیں، مدرسہ نہیں، مشعل نہیں، شمع دان نہیں، شمع کے بجائے ڈیوٹ ہوتا ہے، باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں، عمارتوں میں نہ صفائی ہے، نہ موزونی، نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں ایک لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں، عورتیں دھوتی باندھتی ہیں، جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں"۔

بیوہ جات کی ترقی

سرسبزی وشادابی کے باوجود اس ملک میں بیوہ جات اور پھل بہت کم تعداد میں اور کم حیثیت ہوتے ہیں، اور جو کچھ پیدا ہوتے تو وہ عموماً خودرو ہیں، جن کی طرف اہل ملک خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے تھے لیکن جب مغل اس ملک میں داخل ہوئے تو انہوں نے پھلوں اور بیوہ جات کو بڑی ترقی دی۔

صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کی ترقی :

سلطان محمد بن شاہ گجراتی نے متعدد کارخانے قائم کیے تھے، جن میں کپڑا بنائی، رنگائی، چھپائی اور ڈیزائن تیار کرنے کا کام ہوتا تھا، سنگ تراشی، ہاتھی دانت، ریشمی کپڑے اور کاغذ سازی کے کارخانے بھی قائم کیے گیے، نیز سلطان کے عظیم کارناموں میں ملک کی ترقی، مدرسوں، مسجدوں، مسافر خانوں کی تعمیر، زرعی پیداوار میں اضافہ، پھلدار درختوں اور باغات کی تعمیر شامل ہے، اس حقیت کا اعتراف سابق صدر کانگریس اور جنگ آزادی کے ایک رہنما ڈاکٹر پٹابی سیتارمیہ نے کانگریس کے اجلاس جے پور میں اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے، ہمارے نظم ونسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا، نیز وہ ملک کے افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب واجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے"۔

(بحوالہ خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس اجلاس جے پور ۱۹۴۸)۔

اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے طبی، تعمیری اور تصنیفی ناقابل فراموش کارنامے ہیں، نیز علمائے کرام صوفیائے عظام کی تعلیم وتربیت اور صحبت کے اثر سے پورے کے پورے معاشرے کی کایا پلٹ ہوگئی، اس کا رخ شر سے خیر کی طرف ہوگیا، لوگوں کے عادات واطوار بدل گیے، مزاج بدل گیا، نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔

اس کتاب میں حضرت مولانا نے مسلمانوں کی مشکلات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کو عارضی بتایا ہے: وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستانی مسلمان آج کل ایک آزمائش کے دور سے گذر رہے ہیں، اوران کو اپنی قومی زندگی میں چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ان مشکلات میں بعض خود ان کی غلطیوں کا نتیجہ ہیں، اور بعض ماضی کا ورثہ اور پچھلی تاریخ کا "بقایا" ہیں، کچھ دشواریاں ایسی ہیں، جو حوادث وواقعات کی پیدا کردہ ہیں، جو چند برسوں قبل ہندوستان میں پیش آئے، لیکن اس میں شک نہیں کہ راہ کی یہ دشواریاں عارضی ہیں اور ہمارے دیکھتے دیکھتے ابتلا کا یہ موسم گذرنے جانے والا ہے، بشرطیکہ مسلمان صبر وضبط سے کام لیں اور مسائل کو ٹھنڈے دماغ سے حل کرنے کی کوشش کریں"۔

اختتامیہ

اس کتاب کے مذکورہ بالا مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہر ہندوستانی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، بلکہ ان حقائق کو دیکھ کر یقین ہوجاتا ہے کہ مسلمانان ہند جو آج کل تاریخ کے نازک ترین دور سے گذر رہے ہیں، زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں، اس ملک کی حد تک ان کی شخصیت لازوال اور زندۂ جاوید ہے۔☆☆☆

کاروانِ ایمان وعزیمت: ایک مطالعہ

ـــــ ڈاکٹر تابش مہدی

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بیسویں صدی کے اعاظم رجال میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں، جس محبوبیت ومقبولیت سے سرفراز کیا تھا، وہ آج کے دور میں نایاب سی ہے۔ اُن کی یہ محبوبیت ومقبولیت کسی ایک قوم وملت، کسی ایک مسلک ومشرب یا کسی ایک طبقے تک محدود نہیں تھی، بل کہ وہ ہر قوم وملت، ہر مسلک ومشرب اور انسانوں کے ہر طبقے کے لیے پسندیدہ وبرگزیدہ تھے۔ اِس مقبولیت ومحبوبیت کی بڑی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ اللہ عزّ وجل نے، انھیں گوناگوں صفات وخصوصیات سے ہم کنار کیا تھا۔ وہ پوری دنیا میں ایک مفکر ودانش ور کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے اور ایک مورّخ و تذکرہ نگار کی حیثیت سے بھی، اُنھیں نام وری حاصل تھی۔ انھیں ایک سیرت نگار وسوانح نویس کے طور پر بھی جانا اور پہچانا جاتا تھا اور ایک عظیم المرتبت ادیب وانشا پرداز کی حیثیت سے بھی انھیں اعتبار حاصل تھا۔ وہ ایک مصلح، مربی اور مرشد کامل بھی تھے اور تفسیر قرآن مجید وحدیث اور اصول حدیث میں بھی ان کی اپنی ایک پہچان تھی اور ایک بڑے عالم، منکسر المزاج، صاحب دل، ہم دردوغم گسار اور عالی نگاہ انسان کی حیثیت سے بھی انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ ہم جس پہلو سے بھی اُنھیں دیکھنے اور آنکنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ایک روشن چراغ کی طرح چمکتے اور جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ کسی بھی پہلو سے ان کی شخصیت ادھوری یا ناقص نہیں محسوس ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ طوطی ہند حضرت امیر خسرو دہلویؒ کا یہ شعر ان پر کامل طور پر صادق آتا ہے:

آفاق ہا گردیدہ ام، مہر بُتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

میں بہ ہر اعتبار ایک ادنیٰ بل کہ ادنیٰ ترین طالب علم ہوں۔ کسی بھی اعتبار سے مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جیسی کوہ پیما اور جامع الصفات شخصیت پر کوئی تبصرہ کروں یا ان کی زندگی کے کسی پہلو کو کم یا زیادہ ثابت کرنے کی کوشش کروں۔ تاہم میں نے بھی ایک عقیدت مند طالب علم کی حیثیت سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف وتالیفات کے غالب حصے کا مطالعہ کیا ہے۔

ناچیز راقم نے حضرت مولاناؒ کی وہ کتابیں بھی پڑھی ہیں، جو بہ راہِ راست قرآنِ مجید واحادیث رسولؐ سے متعلق ہیں اور وہ کتابیں بھی، جو سیرتِ رسول یا تذکرہ وسوانح کے ذیل میں آتی ہیں اور ان متعدد کتابوں یا رسائل کا بھی مطالعہ کرتا رہا ہوں، جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی فکر انگیز اور ملت اسلامیہ کے درد وغم میں ڈوبی تقریروں پر مشتمل ہیں اور ان کتابوں اور اخبارات ورسائل کے خصوصی شماروں اور انفرادی طور پر شائع ہونے والے مقالات ومضامین بھی میرے مطالعے میں آتے رہے ہیں، جو خود ان کی حیات وخدمات اور ان کے افکار وخیالات سے متعلق آئے دن

شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب مطالعوں سے میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا ہوں کہ حضرت مولانا بنیادی طور پر ایک داعی و مبلغ تھے اور دعوت و تبلیغ سے اُن کے مزاج و طبیعت کو خصوصی مناسبت تھی۔ خواہ ہم ان کو ایک سیرت نگار و سوانح نویس کی حیثیت سے دیکھیں، خواہ ادیب و انشا پرداز اور مفکر و دانش ور کی حیثیت سے، ہر عنوان سے ان کا دعوتی و تبلیغی مزاج واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ اس لیے کہ ان کی سوچ اور فکر کا محور ہمیشہ اسلام کی دعوت اور دینِ حق کی تبلیغ رہا ہے۔ حتی کہ ان کی خود نوشت کاروانِ زندگی اور وفیاتی کتاب پرانے چراغ کے تمام حصے بھی، ان کے اسی مزاج اور سوچ کے گرد گھومتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا، منتسبین، وابستگان اور ان کے خاندان کے افراد کا بھی وہی مزاج بنا ہوا ہے۔ ان کے بعض وابستگان نے تو اپنے آپ کو دعوت و تبلیغ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انھوں نے تنہا وہ کام کر ڈالا ہے اور کر رہے ہیں، جو بڑی بڑی جماعتوں یا اداروں سے بھی نہیں ہو سکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خاندانی طور پر ورثے میں ملی تھی۔ جن لوگوں نے اس خانوادے کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ میری حقیر رائے کی تصویب کریں گے۔

اِس وقت میرے سامنے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بصارت افزا اور بصیرت افروز کتاب 'کاروان ایمان و عزیمت' ہے۔ یہ کتاب ۳۶×۲۳ (ڈیمائی سائز) کے تقریباً پونے دو سو صفحات کی ہے۔ یہ کتاب امیر المومنین اور سرخیل جماعتِ ایمان و عزیمت حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معروف خلفا اور ان کی جماعت کے بعض اکابر کے تذکروں اور حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے جاری کردہ سلسلے کی ہونے والی مبارک کوششوں پر مشتمل ہے۔ حضرت مصنفؒ نے اپنے مختصر پیش لفظ میں صاف اور واضح طور پر تحریر فرمایا ہے کہ یہ کتاب اصلاً سیرت سید احمد شہیدؒ کا ایک حصہ ہے۔ بل کہ یہ اس کا آخری باب بھی تھا۔ کتاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں میں یہ حصہ باقاعدہ طور پر شامل تھا۔ لیکن جب اس میں اتنے اضافے ہو گئے کہ کتاب کی ضخامت دُگنی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، تو اِسے اس کی افادیت و معنویت کے خیال سے علاحدہ کتابی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔ لیکن اِسے نظامِ قدرت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک مدتِ دراز تک اِسے نہ شائع کیا جا سکا۔ ۲۶/اگست ۱۹۷۹ کو حضرت مصنفؒ نے اِسے اپنے مختصر پیش لفظ کے ساتھ حوالۂ کتابت کیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتابت و طباعت کی جو سہولتیں اب ہیں، وہ اب سے ربع صدی قبل مفقود تھیں۔ حضرت مصنفؒ کے حوالۂ کتابت و طباعت کرنے کے بعد کتاب کی اشاعت میں کیوں اور کتنی تاخیر ہوئی ہوگی، اسے بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے سید احمد شہیدؒ اکادمی لاہور نے شائع کی۔ ہندستان میں مکتبہ اسلام لکھنؤ سے بہت بعد میں شائع ہوئی۔

واضح رہے کہ 'کاروانِ ایمان و عزیمت' میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدا میں جن علما یا رجالِ دعوت و جہاد کا تفصیلی یا اجمالی تذکرہ فرمایا ہے، وہ سب وہ علما و رجالِ دعوت و جہاد ہیں، جن کے تذکرے کسی نہ کسی پہلو سے سیرت سید احمد شہیدؒ میں بھی آ چکے ہیں۔ موجودہ کتاب کی اہمیت یا معنویت یہ ہے کہ حضرت مصنف نے بعدِ تحقیق و جستجو بڑی حد تک ان کا مفصلاً تذکرہ قلم بند فرمایا ہے۔ اس سے قاری کی معلومات میں دو چند اضافہ ہوگا۔

'کاروان ایمان وعزیمت' میں صفحہ ۱۱ر سے صفحہ ۶۰ر تک حضرت سید احمد شہیدؒ کے پانچ مشہور ومعروف خلفا واکابر جماعت کا تذکرہ ہے۔ یہ سب وہ شخصیات ہیں، جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے دستِ راست کی حیثیت رکھتے تھے اور کئی اعتبار سے انھیں اپنے مرشد کے قائم مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ اُن میں سب سے پہلے ہماری ملاقات حضرت مولانا سید عبدالحی بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتی ہے۔ مولانا عبدالحی بڈھانوی حضرت مولانا عبدالعزیزؒ کے خویش بھی تھے اور شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ کے رشتے سے، یہ ان کے بھتیجے بھی تھے۔ یعنی شاہ صاحب ان کے پھوپھا تھے۔ ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ ان کے والد محترم کے شاگرد بھی تھے۔ اس طرح سے وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس لیے شاہ صاحب اُنھیں بہت چاہتے تھے۔

مولانا عبدالحی بڈھانوی اپنے علم وفضل کے اعتبار سے پورے ملک میں شہرت رکھتے تھے۔ تفسیر میں شاہ صاحب کے تلامذہ میں انھیں غیر معمولی فضیلت حاصل تھی۔ شاہ صاحب نے انھیں شیخ الاسلام، تاج المفسرین، فخر المحدثین اور سرآمد علمائے محققین کے القاب سے نوازا ہے۔ حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں اپنی جماعت کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔

حضرت مولانا عبدالحی بڈھانوی کے بعد کاروانِ ایمان وعزیمت میں ہماری ملاقات حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل فاروقی شہید رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتی ہے۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل حضرتِ محدثِ دہلوی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے، شاہ عبدالغنی کے فرزند، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ کے محبوب وعزیز بھتیجے تھے۔ حضرت مصنفؒ نے ان کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ 'مولانا اسماعیل اسلام کے اُن اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں ہیں، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔' حضرت مولاناؒ نے لکھا ہے کہ تعلیم میں بھی آپ کی خوش نصیبی یہ تھی کہ انھیں ہندستان کے فاضل ترین اساتذہ (جن کے پاس سمرقند و بخارا، ایران و افغانستان کے طلبہ شدِ رحال کرکے آتے تھے اور ان سے ایک سبق پڑھ لینے کو اپنا حاصل سفر سمجھتے تھے) سے استفادے کا موقع ملا۔ حضرت مصنف کتاب نے انھیں مجتہدانہ ذہن ودماغ کا حامل بتایا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیلؒ نے اس دور کے معمول کے مطابق دہلی کو اپنے مواعظ ودروس کا مرکز بنایا۔ جامع مسجد ان کے دروس کی خصوصی آماج گاہ تھی۔ چوں کہ اُس زمانے میں جہالت، شرک وبدعت اور غیر اسلامی رسوم، رواج کا دور دورہ تھا، اس لیے عوام الناس کو ان کی تعلیمات نئی اور اٹ پٹی سی معلوم ہوتی تھیں۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ دہلی کا بڑا حصہ ان کی تعلیمات سے اتنا بد دل ہوا کہ ان کی جان تک کا دشمن ہوگیا۔ شاہ اسماعیلؒ سے اللہ تعالیٰ نے دینِ حق کے غلبہ ونفاذ کی وہ خدمات لیں، جو کم ہی لوگوں کے حصے میں آئی ہوں گی۔ مولانا سید عبدالحی بڈھانویؒ کی ترغیب وتشویق پر شاہ صاحب حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت سے وابستہ ہوئے۔ یہ وابستگی ان کے آخری سانس تک باقی رہی۔ حضرت مصنفؒ نے اُن کے متعلق جو تفصیلی باتیں لکھی ہیں، وہ اس قابل ہیں کہ انھیں الگ سے کتابچے کی شکل میں شائع کراکے اُسے پوری دنیا کے علما ومبلغین تک پہنچایا جائے۔

طائفۂ ایمان وعزیمت، کی تیسری اہم شخصیت مولانا

سید محمد علی رام پوریؒ کی ہے۔ مولانا سید محمد علی علامہ معقول ومنقول حضرت مولانا حیدر علیؒ کے برادرِ خرد، حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ اور اپنے زمانے کے معروف ہادی ومرشد تھے۔ حضرت مصنف کی تحقیق کے مطابق مولانا محمد علی اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو حضرت سید صاحبؒ نے سوات (موجودہ پاکستان) سے دعوت و اصلاح کی غرض سے جنوبی ہند بھیجا تھا۔ وہاں ان دونوں سے سید صاحب کو غیر معمولی نفع وکام یابی کا یقین تھا۔ دیار مدراس میں ان دنوں جہالت وسفاہت اور شرک و بدعت کا عروج تھا۔ اللہ کی خصوصی مدد ونصرت سے ان دونوں بزرگوں نے مدراس اور اس کے دیار میں کافی ہدایت واصلاح کا کام کیا۔ حضرت مصنف کی تحقیق کے مطابق ۱۲۵۲ھ میں مرشد کی اجازت سے وہاں سے واپسی اختیار کی اور پانچ چھے برس کے بعد ۱۲۵۸ھ میں اصلاح وارشاد میں مشغول رہتے ہوئے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا ولایت علی عظیم آبادی تیرہویں صدی ہجری کے معروف داعی و مصلح تھے۔ ان کا شمار علما صادق پور کے برگزیدہ لوگوں میں تھا۔ یہ ننہالی اور ددیہالی دونوں اعتبار سے اپنے دیار کے معزز ومکرم اور اصحاب علم و دعوت میں تھے۔ حضرت مصنف نے ان کے بارے میں بتایا ہے کہ رائے بریلی میں شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ سے حدیث پڑھتے تھے، جماعت کی نیابت کا شرف حاصل تھا، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے، اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے تھے اور مٹی گارے کا بھی کام کرتے تھے۔ بہ قول حضرت مصنفؒ ان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اوصاف اور اہل اللہ کے کمالات پائے جاتے تھے۔ رہایش نہایت سادہ تھی اور اپنے نفس پر پورا قابو رکھتے تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے پانچ منتخب خلفا و اکابر جماعت میں مولانا یحییٰ علی کا نام نامی اسم گرامی نہایت ممتاز و نمایاں ہے۔ یہ عظیم آبادی جماعتِ مجاہدین کے امیر تھے۔ اپنے مرشد حضرت سید احمد شہیدؒ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ حضرت مصنف نے نہایت تحقیق وجستجو کے بعد ان کی زندگی اور دعوتی واصلاحی کارناموں کو قلم بند فرمایا ہے۔

'کاروانِ ایمان وعزیمت' میں صفحہ ۶۱ سے صفحہ ۸۰ تک اہل صادق پور کی دینی وتبلیغی جدوجہد، تنظیم جماعت اور مسلمانوں کی اس سے خصوصی لگاؤ اور مناسبت کا تذکرہ ہے۔ ہر سطر پڑھنے اور اپنے ذہن ودل میں سمو لینے کے قابل ہے۔ اِسے پڑھ کر رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ اس میں جن حالات وکیفیات کا تذکرہ ہے، کاش اب بھی ہم اُنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

کاروانِ ایمان وعزیمت میں صفحہ ۸۱ سے آخر تک حروفِ تہجی کی ترتیب سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ان خلفا و مریدین کے تذکرے ہیں، جنھوں نے اپنی اپنی جگہ پر اپنے مرشد کے نقشۂ عمل کے مطابق پوری زندگی دعوت دین اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے وقف کردی۔ یہ شخصیات بھی کسی نہ کسی پہلو سے سیرت سید احمد شہید میں موجود ہیں۔ کہیں اسماً ووصراحتاً اور کہیں محض اشارۃً۔ ان کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے۔ ان میں بعض علما یا خلفا تو وہ ہیں، جن کے خانوادے میں علم وعرفان کا وہ چراغ اب بھی کسی نہ کسی درجے میں روشن ہے، جو ان کے مرشد کامل نے جلایا تھا۔ ان میں مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا رجب علی صدیقی جون پوری، مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری، مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری، میاں نور محمد علوی جھنجھانوی، مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور سید شاہ ضیاء النبی کے اسمائے

گرامی خصوصیت کے ساتھ جانے پہچانے جاتے ہیں۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے خانوادے کے متعدد لوگ علم وتحقیق سے جڑے ہوے ہیں۔ حضرت مولانا رجب علی صدیقی جون پوری ہادیِ بنگال حضرت مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری کے برادرِ خرد تھے۔ الحمدللہ وہ خانوادہ اب بھی اصلاح و تربیت کے لیے جانا جاتا ہے۔ ان کے لکڑ پوتے حضرت مولانا شاہ ظفر احمد صدیقی جون پوری اپنے علم وفضل، عالمانہ شان وشوکت اور روحانیت ومعرفت کے لیے جون پور ہی نہیں، ہندستان کے ایک بڑے حصے میں شہرت رکھتے ہیں۔ بنگلا دیش میں ان کے لاکھوں عقیدت مند موجود ہیں، جہاں وہ ان کی طلب وخواہش پر تقریباً ہر سال کئی کئی مہینے رہ کر انھیں اپنے دینی و روحانی فیض سے سیراب کرتے ہیں۔ حضرت مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا خانوادہ بھی اپنی حیثیت و بساط کی حد تک دین سے جڑا ہوا ہے۔ ناچیز راقم کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ ان کے قائم کردہ مدرسہ قرآنیہ جون پور میں کئی سال تک تعلیم حاصل کی ہے۔ حضرت مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری کے خانوادے میں بھی رشد وہدایت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کے پوتے حضرت مولانا عبدالباطن جون پوریؒ سے راقم کو ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کے بعد ان کے فرزندوں اور پوتوں سے بھی کسی نہ کسی درجے میں ربط رہتا ہے۔ ان کے خاندان کے متعدد علما سال کے سال بنگلا دیش جا کر وہاں دو چار ماہ قیام کر کے طالبین حق کو اپنے فیوض و برکات سے سیراب کرتے ہیں۔ تیرہویں صدی ہجری کے مشہور شاعر اور مرزا غالب کے ہم عصر حضرت حکیم مومن خاں مومن دہلوی بھی جماعت ایمان وعزیمت سے وابستہ تھے۔ گرچہ انھوں نے دو شادیاں کیں لیکن ان کا صلبی سلسلہ باقی نہیں رہ سکا۔ حضرت میاں نور محمد علوی جھنجھانوی چشتیہ سلسلے کے بڑے بزرگوں میں تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ان کے جید خلفا میں تھے۔ ان کا روحانی سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ان شاء اللہ تادیر جاری رہے گا۔ حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور حضرت شاہ سید ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ کے خانوادے کے بزرگوں میں تھے۔ ان سب کا اصلاحی و روحانی سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ تادیر جاری رہے گا۔ ناچیز راقم کے جدِ امجد حضرت میاں ثابت علی ناجیہ پوری (پرتاب گڑھ) مجدد وقت، مجاہد اسلام حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ کے خصوصی متعلقین میں تھے۔ حضرت سید محمد امین رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی سے شرف ارادت وخلافت حاصل تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت سید شاہ ضیاء النبی رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سلسلہ قائم ہوا اور تادمِ آخر قائم رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ زیر مطالعہ کتاب 'کاروانِ ایمان و عزیمت' ایک ایسا گنجینۂ معرفت وحکمت اور مخزنِ دعوت و روحانیت ہے، جسے پڑھ کر نہ جانے کتنے قلوب میں ایمان و عزیمت کی گرمی پیدا ہوگی اور نہ جانے کتنے بندگانِ الٰہی اس کے مطالعے سے اپنے تاب ناک دینی، دعوتی اور روحانی ماضی سے اپنا رشتہ استوار کر سکیں گے۔ حضرت مصنف کے ملتِ اسلامیہ پر جملہ احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو سیرت سید احمد شہید کا تتمہ نہ بنا کر اسے الگ سے کتابی شکل دے کر اس کے فیض کو عام کیا۔ ☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دعوتی اسلوب کی خصوصیات

مولانا اقبال احمد ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ہماری یہ کائنات قدرت کی نیرنگیوں اور فطرت کی بوقلمونیوں کی آماجگاہ اور حوادث ووقائع کی جولانگاہ ہے۔ یہاں جو آیا وہ جانے کے لیے آیا، اور جو گیا وہ پلٹ کر کبھی نہیں آیا۔ لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کے اِس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے، اور لوگ اُن کے کاموں اور خدمات کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور تاریخ کے اوراق ہمیشہ ان کے کارناموں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

میرِ کارواں، سالارِ دوراں، ادبِ اسلامی کے روحِ رواں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی بھی ایسی ہی ایک بے مثال، عالمی اور عبقری شخصیت تھی، جس کی مثال صدیوں اور قرنوں میں ملنی محال ہے، اور جو محتاج تعارف نہیں، جس کی عطر بیزی نے پورے عالمِ اسلام کے مشامِ جاں کو معطر کیا۔ آپ جیسا دیدہ ور چمنستان دہر میں بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے، اور جس کے لیے نرگسِ چمن ہزاروں سال روتی ہے تب کہیں صدیوں میں آپ جیسا دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ کیا عرب، کیا عجم، ہر جگہ آپ کا طوطی بولتا تھا، اور یورپ ہو یا امریکہ، ہندوستان ہو یا کوئی عرب ملک، ہر جگہ آپ میرِ مجلس اور صدر نشیں ہوتے تھے۔ بقول مولانا ضیاء الدین اصلاحی: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی شہرہ آفاق عالم و مصنف تھے۔ ان کے مرغِ شہرت کی پرواز ہندوستان کی فضا سے لے کر دنیا کے کونے کونے تک وسیع تھی، مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک ان کا غلغلہ بلند تھا، اور وہ عرب وعجم میں یکساں محبوب ومقبول اور مکرم ومحترم تھے:

هذا الذي تعرف البطحاء وطأته
البيت يعرفه و الحل و الحرم

حضرت مولاناؒ کی شخصیت ہشت پہل شخصیت تھی، آپ جامعِ کمالات اور مجموعۂ شش جہات تھے، آپ بیک وقت معلم، متکلم، خطیب، انشاپرداز، سیرت نگار، مؤرخ، نقاد، پیامِ انسانیت کے داعی، قدیم وجدید علوم کے سنگم، علومِ قرآنی کے دانائے رموز، علومِ حدیث وسیرت کے واقفِ اسرار، نباضِ شریعت، رہ نوردِ طریقت، صوفی باصفا، عالمِ بے ریا، شیخِ وقت اور مجددِ دین تھے، آپ کی پوری زندگی دعوتِ اسلام، فکرِ

اسلام اور تبلیغِ دین سے عبارت تھی۔ آپ نرے عالم، زاہدِ خشک اور واعظِ بے کیف نہیں تھے، بلکہ آپ کی تحریر وتقریر میں وہ دلکشی، رعنائی اور برنائی پائی جاتی تھی جو قاری اور سامع کو اپنا گرویدہ اور شیفتہ وشیدا بنالیتی تھی۔ آپ ادب کی قوت وتاثیر سے نہ صرف واقف بلکہ اُس کے پرزور داعی تھے، اور آپ ہی کی کوششوں کے نتیجے میں اور آپ ہی کی سرپرستی وسربراہی میں رابطہ ادبِ اسلامی کی اِس عالمی انجمن کی داغ بیل پڑی، جس کے تحت ہمارا آج کا یہ سیمینار منعقد ہورہا ہے، کیونکہ مولانا کے نزدیک ادب اپنے اندر عظیم تعمیری وتخریبی طاقت رکھتا ہے، اِس سے خیر اور شر دونوں کام لیے جاسکتے ہیں، اِس لیے اِسے کسی بھی حال میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے، اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اُس سے کون سا کام لیتے ہیں، خیر کا یا شر کا؟ مولانا فرماتے ہیں:

''مجھے اپنی تدریسی وتعلیمی مشغولیت کے زمانے میں بھی اور اپنے تحریری وتصنیفی دائرے کے اندر بھی، ہمیشہ اِس حقیقت کا اِدراک رہا کہ ادب اپنے اندر عظیم تعمیری وتخریبی طاقت رکھتا ہے، اِس سے ایک طرف عقائدِ صحیحہ کی استواری، اور صحت منداور صالح رجحانات کی آبیاری کا کام لیا جاسکتا ہے، تو دوسری طرف اخلاقی انسانی قدروں پر تیشہ زنی اور ذہنی و معاشرتی انتشار کا بھی، اور ہر دور میں اِس کی روشن اور ناقابلِ انکار شہادتیں ملتی ہیں۔''

(کاروان زندگی)

مزید ادب کا تعارف کراتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

'' ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفے میں ہو، اُس کی شرط یہ ہے کہ بات اِس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اُس سے لطف اُٹھائے اور اُس کو قبول کرے۔''

ادب کی یہی وہ طاقت اور تاثیر تھی جو مولانا کے تمام علمی وتالیفی، دینی ودعوتی کاموں کا جزوِ غالب تھی، اور مولانا نے اِس سے خدمتِ دین کی راہ میں بہت کام لیا۔ آپ ایک صاحبِ طرز ادیب اور ماہر انشا پرداز تھے، زبان و بیان پر قدرت تھی، اسلوب میں جدت وندرت اور سلاست ومتانت پائی جاتی تھی۔ مولانا کا اپنا ایک مخصوص اور منفرد اسلوبِ نگارش ہے، جس میں حلاوت، چاشنی، برجستگی، شیفتگی، حسن و جمال اور سلاست وروانی سبھی کچھ ہے۔

حضرت مولانا نے مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہما کے اسلوب سے متعلق جو بات لکھی ہے، بعینہ وہی بات خود حضرت مولانا کے اسلوب پر صادق آتی ہے، ملاحظہ ہو، مولانا ندویؒ فرماتے ہیں:

''ایک فطری ادیب اور صاحبِ قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک وپُر تقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرزِ ادا کی دل آویزی کو روک نہیں سکتا، اور اُس کے اپنے ادبی ذوق اور اسلوبِ تحریر سے عاری وخالی ہوجانا ناممکن ہوتا ہے۔ ..... مولانا عبدالماجد

دریابادیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی کوئی تحریر زبان وادب کی چاشنی سے خالی نہیں، اور کہیں اُن کا اسلوبِ تحریر جو اُن کی شخصیت بن گیا ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔'' (پرانے چراغ)

بالکل یہی بات ہم حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا اسلوب اُن کی شخصیت کی پہچان بن گیا ہے، جو کسی بھی حال میں اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا ہے۔

مولانا ابو العرفان خاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ سابق استاد و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج اور اسلوب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کو مولانا کی ہر تصنیف میں خواہ وہ کسی موضوع پر ہو، حقیقت پسندی، تاریخ اور زندگی کے گہرے مطالعے کے تابناک نقوش نظر آئیں گے، اور آپ فراستِ ایمانی کی جھلکیاں بھی دیکھیں گے، روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اقوام وملل کے حال و مستقبل پر اثر ڈالنے والے بڑے نتائج کے استنباط اور استخراج کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو امتیازی قوت و صلاحیت نصیب فرمائی ہے، ساتھ ہی اِس بات کا اپنی ہر تصنیف میں آپ نے اہتمام رکھا ہے کہ جو بات کہی اور لکھی جائے وہ علم و تحقیق کے اعتبار سے باوزن اور باوقار ہونے کے ساتھ اپنے اندر مخاطبین کے لیے زندگی کا پیغام اور موجودہ مسائل کے حل کا سامان رکھتی ہو، یہی وجہ ہے کہ ہزاروں صفحات لکھنے کے باوجود ان کا اشہبِ قلم ہمیشہ مکے کی راہ چلتا رہا، ترکستان کی راہ کی طرف کبھی نہیں چلا۔ طرزِ ادا کی بے تکلفی اور بے ساختگی، زبان و بیان کی حلاوت و شیرینی اور عام فہم و سادہ انداز اُس پر مستزاد۔''

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر و تحریر میں قرآن و حدیث کی تعلیمات اور مخلص اہلِ فکر کے افکار کے مستند حوالوں کے ذریعے سے اپنی باتوں کو مؤثر بنایا، مولانا کی کتابوں میں متعدد تصنیفات مسلمانوں کی غیر معمولی شخصیات کی سوانح پر ہیں ، اور متعدد تصنیفات مسلمان قوموں کے اخلاقی و فکری جائزوں پر مشتمل ہیں ، اور متعدد تصنیفات اصلاح و تربیت کے موضوعات پر مشتمل ہیں، متعدد تصنیفات خالص علمی اور فکری مواد پر مشتمل ہیں، لیکن اُن میں بھی مولانا کا اسلوب اصلاحی و تربیتی رہا ہے۔ مولانا کی تصنیفات و تقاریر کا اسلوب خواہ علمی و تحقیقی موضوع ہو، عموماً دلنواز اور مؤثر انداز کا ہے، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ پختہ اور بلیغ ہے۔

حضرت مولانا کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ آپ اشارے کنایے میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں، لیکن اتنی حلاوت اور مٹھاس کے ساتھ کہ سننے والا اُس سے یہ نہیں محسوس کرتا کہ اُس پر الگ سے کوئی چیز لادی جارہی ہے، بلکہ وہ اُسے اپنے دل کی آواز سمجھتے ہوئے قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بنگلہ دیش کا لسانی المیہ ایک بڑا المیہ تھا ، جس سے ہر دردمند کا دل دکھا، اور مولانا نے بھی اُس کی کسک

دل میں محسوس کی۔ پھر مولانا کا ۱۹۸۴ء میں بنگلہ دیش کا سفر ہوا، وہاں آپ نے مختلف اجتماعات میں تقریریں کیں، اور اُن میں کسی بھی زبان سے تعصب کی ہولنا کی اور خطرنا کی سے آگاہ کیا، لیکن اِس انداز میں کہ کسی کو اُس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، چنانچہ ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"اُنھیں صوفیوں اور اُنھیں درویشوں کے ذریعے یہاں اسلام آیا، جنھوں نے دماغ سے بات کرنے سے پہلے دل سے بات کی۔ اُنھوں نے منہ کی زبان سے بات نہیں کی، دل کی زبان سے کی، منہ کی زبانیں پچاسوں ہوسکتی ہیں، لیکن دل کی زبان ایک ہے، روح کی زبان ایک ہے، سچائی کی زبان ایک ہے، محبت کی زبان ایک ہے، محبت کی زبان ہر جگہ سمجھی جاتی ہے، اور بعض مرتبہ ترجمان کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، آنکھوں کی چمک، لبوں کی مسکراہٹ، دل سے اُبلتا ہوا محبت کا فوارہ بڑے بڑے دشمنوں کو اور جنگل کے شیروں اور چیتوں کو اپنا کلمہ پڑھنے والا بنالیتا ہے۔"

مزاح اور ظرافت بھی کلام میں خوبی پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ اور وسیلہ ہے، مولانا نے اِس سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اُسی موقع پر بنگلہ دیش میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"حضرات! آپ مجھے معاف کریں اگر میری بات لمبی ہوجائے، میں "دخل در ماکولات" کررہا ہوں، "دخل در معقولات" بھی اچھی چیز نہیں ہے، لیکن "دخل در ماکولات" اُس سے بھی زیادہ سخت چیز ہے کہ یہ کھانے کا وقت تھا، میں آپ سے باتیں کررہا ہوں، کھانا تو مجھے ہر جگہ مل جائے گا، لیکن میں آپ کو کہاں ڈھونڈھوں گا؟۔"

آپ نے دیکھا! مولانا نے کس خوبصورتی اور خوبی سے، اور ظرافت آمیز حسنِ بیان سے اپنی بات بغیر کسی جبر و اکراہ کے سننے پر آمادہ کیا، آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ اس طرز تخاطب سے سامعین پر کیا اثر پڑا ہوگا۔

مولانا کا ایمان پختہ اور عقیدہ راسخ تھا، آپ کو اسلام کی حقانیت پر پورا یقین اور جزم تھا، آپ دوسروں کو بھی مسلمان بن کر رہنے اور ایمان کو سب سے بڑھ کر عزیز رکھنے کی تلقین فرماتے تھے، اور ایسے البیلے اسلوب میں کہ جو "از دل خیزد و بر دل ریزد" کا مصداق ہوتا تھا۔ ایک تقریر میں کہتے ہیں:

"آپ کو اِس ملک میں ہر حال میں مسلمان بن کر رہنا ہے، آپ جانوروں اور پرندوں کی طرح زندگی نہیں گزاریں گے جن کو راتب کا ملنا کافی ہے۔ ہم محض "راتب" پر اِسی ملک میں نہیں، کسی عرب یا خالص مسلمان ملک کی سرزمین پر بھی رہنے پر تیار نہیں، جہاں "راتب" کے سوا ہم کو باعزت، آزاد اور ضمیر و

عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کی دولت میسر نہیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس دن آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو ایمان سب سے بڑھ کر عزیز ہے، ایمان کے بغیر بچوں کا جینا بھی آپ کو مطلوب نہیں، اُسی وقت سے حالات میں تبدیلی آجائے گی اور مشکلات کے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔'' (تکبیر مسلسل)

مولانا اپنی خودنوشت سوانح ''کاروانِ زندگی'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

'' ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے اسلام میں خود کفیل ہیں ،اُنھوں نے اپنا عقیدہ اور ایمان، اپنا جان و مال اسلام کے دائمی اور غیر فانی مذہب اور تعلیمات سے وابستہ کیا ہے۔ کسی قوم وملک حتی کہ بلادِ عربیہ سے اور کسی عرب قوم سے بھی وابستہ نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے محض اللہ کے بھروسے پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اُن کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا ہے، ہم انشاء اللہ وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلکِ زندگی کے معاملے میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں''۔

اخیر میں ہم مولانا کی ایک عبارت پر اپنی بات ختم کرتے ہیں جو اُنھوں نے لکھنؤ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مخلوط مجمع میں فرمائی تھی ، اِس میں مولانا کی بصیرت ، انسانیت کی دردمندی ، وسعتِ مطالعہ اور تاریخ سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا نے فرمایا:

''میں بہت معذرت کے ساتھ اتنا عرض کردوں کہ میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، لیکن میری توجہ اور میری دلچسپی کا مرکز دو موضوع ہیں ، ایک مذہب اور اُس میں بھی تقابلی مطالعہ اور ایک تاریخ۔ اور تاریخ صرف ایک حصے کی نہیں ، بلکہ تاریخِ عالم۔ میں نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں اُس کا بڑا ذخیرہ دیکھا اور پڑھا ہے، اِس مطالعے کے نتیجے میں میں اِس حقیقت تک پہونچا ہوں کہ دنیا کے مذاہب میں سب سے زیادہ اگر کسی چیز پر اتفاق ہے تو وہ یہ ہے کہ ظلم بری چیز ہے ،اور اِس دنیا کو پیدا کرنے والے کو پسند نہیں، اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، وہ بتاتی ہے کہ ظلم سے بعض اوقات بڑی بڑی سلطنتوں کے چراغ گل ہو گیے ہیں، اور معاشرے پر بادِ خزاں چل گئی ہے۔ اُن پر مکمل زوال آگیا ہے اور سارے علمی و ادبی کارنامے اور ذخیرے خاک میں مل گئے ہیں۔''

☆☆☆☆☆☆

تحریک پیام انسانیت

اہمیت وضرورت

مولانا سعود الحسن ندوی
مدرسہ دینیہ، غازی پور، یوپی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی فہم وبصیرت اور ایمانی فراست کا زمانہ قائل ہے۔ آپ نے وطن عزیز میں حالات کا رخ دیکھ کر مشکلات و مسائل کے حل کے لیے اقدامات فرمائے، فکر مندی وسنجیدگی کے ساتھ پیش بندیاں کیں۔ گوکہ حضرت مولاناؒ خالصتاً تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والے اور اسی مزاج کے حامل خاندان کے فرد تھے، لہذا موروثی ذوق کے مطابق اگر قلم وقرطاس سے ہی رشتہ استوار رکھتے تو اس میں بالکل حرج نہ تھا۔ لیکن ملت کے تئیں فکرمندی اور انسانیت کے لیے دردمندی ودلسوزی اور ملکی مسائل سے دلچسپی نے انھیں مضطرب و بے چین رکھا اور انھوں نے ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے ملک کے طول وعرض میں انسانیت کا پیغام پہنچانے اور انسانیت کی سربلندی کے لیے کوششیں کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

ایک خطاب میں آپ نے فرمایا تھا:

ہماری عمر، ہمارے مشغلے، اور ہمارا Taste، اور ہمارا ذوق، اور ہماری جو ذمہ داریاں ہیں، بہت سے اداروں کی ممبرشپ اور کہیں کہیں کی پریسڈنٹی، اور چیرمین شپ ہے، یہ سب چیزیں کافی تھیں کہ ہم بیٹھ کر لکھتے پڑھتے رہتے، مگر ہم نے سوچا' خدا نے ہم کو Conscience دیا ہے، ہم نے کہا: کچھ نہیں چلے گا اگر اس ملک میں نارمل حالات نہیں ہیں، اگر اس ملک میں امن واطمینان نہیں ہے تو پھر نہ لکھنا پڑھنا ہوسکتا ہے اور نہ باہر نکلنا ہوسکتا ہے، اور نہ باہر جاکر کوئی خوشی ہوسکتی ہے۔(۱)

آپ نے دوراندیشی، ذہن رسا اور خداداد صلاحیت کی بنیاد پر یہ محسوس فرمالیا تھا کہ ملک کے بگڑتے ہوئے حالات میں گوشہ نشینی مناسب نہ ہوگی، لہٰذا اگر ایک جانب آپ کے خامۂ گہر بار سے علم وحکمت کے چشمے جاری ہوئے تو دوسری جانب ''وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل'' سے بھی آپ کی زندگی عبارت رہی۔ ابتدائی دعوتی زندگی میں ہی جب کہ دعوت وتبلیغ کے لیے اسفار کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا آپ نے ملکی حالات کے تناظر میں اس اہم ضرورت کی جانب بھی توجہ فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت والا میں بصیرت اور حالات کا ادراک کرلینے کی وافر صلاحیت ودیعت فرمائی تھی جس کے سبب آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، ملک کے بدلتے ہوئے

حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ کا الہامی ارادہ وفیصلہ تھا۔ اس سمت کوششوں کو کیوں اس حد تک ضروری سمجھتے تھے درج ذیل خطاب میں دیکھئے۔

آپ نے فرمایا:

''ہم نے اگر ہندوستان کی اصل آبادی کو نظر انداز کیا، اور اسلام کا پیغام اس تک نہیں پہنچایا، اور اسے اپنے اخلاق سے تسخیر نہیں کیا اور ان کے دلوں میں ہم نے گھر نہیں کیا، تو (اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے یہ ملک بھی کسی وقت اسپین بن سکتا ہے) .....ہم مسلمانوں کو اب اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر سو فیصد مسلمان تہجد گزار ہو جائیں، اور ہر مسلمان کے ہاتھ میں تسبیح آجائے اور ہر مسلمان اشراق اور چاشت کا پابند ہو جائے، لیکن اگر اکثریت اس سے نامانوس ہے، اکثریت اپنے دل میں اس کی طرف سے زہر لیے بیٹھی ہے، اور سینے میں انگارے سلگ رہے ہیں، تو خدانخواستہ جس وقت اس ملک میں کوئی بھونچال آئے گا، تو ہم اپنی ان تمام عبادتوں، نوافل کے ساتھ بے دخل ہو جائیں گے، اس وقت نوافل تو نوافل جو بنیادی چیزیں ہیں وہ بھی نہیں رہیں گی، اس لیے دینی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اس آبادی کو اپنے سے مانوس بنائیں''۔(۲)

بقول مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب:

''آپ نے محسوس فرمالیا تھا کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ورنہ یہ ساری کوششیں نقش برآب ثابت ہوں گی۔ حضرت مولاناؒ کا خیال تھا کہ اگر ملک کی اکثریت غلط راستے پر پڑ گئی تو ملک بھی خطرے میں ہے اور ملک کو بھی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑ سکتا ہے، یہ آزادی سے پہلے کا دور تھا''۔(۳)

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد آپ نے اس بات کا ادراک فرمالیا تھا کہ ملک تو بے شک آزادی سے ہمکنار ہو چکا لیکن اس کے باشندوں کے ذہن وضمیر ہنوز آزاد نہیں، وہ تعصب وتنگ نظری کی گرفت میں ہیں۔ عوام کا کیا ذکر تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشوروں کا ذہن بھی صاف نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک محب وطن، حساس اور دردمند دل رکھنے والی شخصیت ملک کے بگڑتے ہوئے حالات پر کس طرح خاموش رہ سکتی ہے۔

آپ نے صاف محسوس فرما لیا تھا کہ اگر ان حالات کا رخ موڑنے اور نفرت وتعصب کی آگ کو الفت و محبت کی شبنم سے سرد کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو ایک خطے اور ایک علاقے کا کیا ذکر، سارا ملک ہی جل اٹھے گا، کسی بھی طبقے کا کوئی فرد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا، آپ کا احساس تھا کہ کسی بھی ملک کی ترقی و بقا اور استحکام اور کام کرنے کے لیے حالات کا معتدل (NORMAL) ہونا بے حد ضروری ہے۔

ان احساسات وخیالات نے آپ کو مضطرب و بے چین کر رکھا تھا، چنانچہ اسی فکرمندی کے سبب ۱۹۵۶ء میں آپ نے ''تحریک پیام انسانیت'' کی بنیاد ڈالی، ملک کے مختلف مقامات پر جلسے ہوئے جن میں آپ نے اخلاص اور دردوسوز کے ساتھ انسانیت کا پیغام سنایا، اپنوں اور برادران وطن دونوں کو انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ ایک انٹرویو میں آپ نے فرمایا تھا:

''واقعہ یہ ہے کہ یہ کوشش ۱۹۵۴ء میں شروع ہوئی، اس سلسلے کی پہلی تقریر جس سے اس مہم کا آغاز کیا گیا، ۹؍جنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک ایسے اجتماع میں کی گئی جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی، اس زمانے میں تبلیغی دورے کے ساتھ اس جز کو شامل کیا گیا تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی مشرقی اضلاع کا ایک دورہ کیا گیا جس میں جون پور، غازی پور، مئو اور گورکھپور میں بڑے بڑے ملے جلے اجتماعات ہوئے، اس دورے کی تقریریں ایک مجموعے میں جمع کردی گئی ہیں''۔(۴)

حضرت مولاناؒ اس تحریک کو دیگر تحریکات کے حق میں کس حد تک ضروری، مفید اور معاون سمجھتے تھے' آپ ہی کی زبانی سنیے:

''پیام انسانیت کی تحریک ملک کی تمام دینی، تعلیمی، و علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت و تحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے، کیونکہ کم سے کم اس کی حیثیت وہ ضرورت ہے جو کسی فراش، یا سقہ، یا زمین برابر کرنے والے، شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی بھی جلسہ یا اجتماع ہوسکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو یا تعلیمی بحث و مذاکرہ کا''۔(۵)

جیسا کہ مذکورہ سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا مگر بانی تحریک حضرت مولاناؒ کے مسلسل بیرونی ممالک کے اسفار نیز علمی و تصنیفی مشاغل کی کثرت کے سبب تواتر کے ساتھ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور طویل عرصہ گزر گیا۔ بالآخر آپ نے ۱۹۷۴ء میں یوپی کے شہر الہ آباد سے دوبارہ اس مہم کا آغاز فرمایا۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولاناؒ کی تحریر کا اقتباس پیش کردیا جائے جس سے تحریک کا تعارف، اس کے مقاصد اور پیام سے مکمل واقفیت حاصل ہوگی، اور ظاہر ہے کہ بانی تحریک کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ہی زیادہ مؤثر ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک اہم اقتباس:

''پیام انسانیت کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۲۸؍۲۹؍۳۰؍دسمبر ۱۹۷۴ء کو الہ آباد سے کیا گیا تھا، جس کا بنیادی مقصد ہندوستان کی پوری آبادی کو بلاتفریق مذہب و ملت انسانیت کے احترام کی دعوت دینا، خدا کے بندوں کی عزت، انسانیت کو نئی زندگی دینا، اور انسانوں کو انسانیت اور اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا تھا، اس ابتدائی دعوت کے بعد سے ملک کے کئی طویل و عریض دورے ہوئے جن میں مختلف ریاستوں میں یہ پیغام بڑے بڑے پبلک جلسوں میں اور خواص و دانشور طبقے کی محفلوں میں سنایا گیا' اور مولانا روم کے بقول ع

من بہر جمعیت نالاں شدم

یہ ایک دکھے ہوئے دل اور چوٹ کھائے ہوئے دماغ کی پکار تھی اور ہندوستان کی تیزی کے ساتھ بگڑتی ہوئی صورت حال کی سچی تصویر اور اس پر اظہار تشویش، جس میں (اگر صورت حال کو نہ صرف باقی رہنے بلکہ بڑھنے کا موقع دیا گیا) کسی تعمیری کام، خدمت انسان، ملک کی سالمیت، اعلی اخلاقی قدروں کی حفاظت حتی کہ ضروریات زندگی کی قانونی اور جائز طریقے پر تکمیل کا موقع اور پھر آگے بڑھ کر معمول کے

مطابق نارمل (NORMAL) زندگی کی بھی گنجائش نہیں رہے گی، بلکہ زندگی عذاب جان اور بھرے پرے گلزار شہر اور اپنے خون پسینے سے سینچا ہوا یہ چمن اور آبائی وطن ایک دشت و بیاباں بن جائے گا، جس میں صرف شکار و شکاری (اور اس سے اگر کچھ ترقی کر کے کہا جائے تو) دکان دار اور گاہک رہ جائیں گے اور شاعر فطرت علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ ملک ایک وسیع قمار خانہ (جوے کا اڈہ) بن کر رہ جائے گا جس میں ہار جیت کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہ جائے گا۔

ایسی صورت میں شریفوں کو اپنی شرافت کو، ضمیر والوں کو اپنا ضمیر، مذہب والوں کو اپنا مذہب، علمی ذوق رکھنے والے اور تحقیق و تصنیف کا کام کرنے والوں کو اپنا کام جاری رکھنا اور اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کرنا بھی مشکل ہو جائے گا، قوموں اور تہذیبوں پر یہ وقت آئے ہیں اور پھر ان کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا گیا۔ اس لیے یہ صورت حال سب کی فکر کا باعث اور سب کی توجہ کی مستحق ہونی چاہئے"۔(۶)

تحریک کی نافعیت اور اس کی ہمہ گیریت سے متعلق حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی مدظلہ فرماتے ہیں:

"اس تحریک پیام انسانیت کا قیام حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ایمانی فراست کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، حالانکہ بعض مسلم قائدین نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ تحریک وحدت ادیان کا اسٹیج ثابت ہو سکتی ہے اور اسلام کی دعوت کے عمل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے، لیکن یہ حقیقت اب تسلیم شدہ ہے کہ یہ تحریک، انسانی سلوک و کردار کی اصلاح اور تمام ادیان کے متفق علیہ امور و معاملات میں اخلاقی اقدار و قیم کی پاس داری کا بہترین اسٹیج ثابت ہوتی ہے، نیز یہ تحریک مادیت، حب مال، حب جاہ اور مصلحت کوشی کی دلدادہ سوسائٹی کی اصلاح وقت کی ضرورت اور موجودہ زمانے کی پکار ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے سارے ادیان و ملل کی طرف سے داد و تحسین حاصل کی ہے"۔..... یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے اور ان کے مابین میل ملاپ پیدا کرنے کا اپنا مقصد اصلی پورا کر لیا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر ان کے مخالف و معاند لوگ جمع ہوئے اور ان لوگوں نے حضرت مولاناؒ کی گفتگو، تقریر اور تحریر سننے اور پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ تحریک واقعتاً اس زمانے کی ضرورت و پکار ہے، نیز مسلمانوں کے سلسلے میں ان کا تصور تبدیل ہوا، اور مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں ان کے موقف اور رویے میں تبدیلی بھی آئی، بلکہ بعض لوگوں نے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کیں، اور مسلمانوں کی حمایت اور مدافعت کرنے والے بن گیے۔"(۷)

آپ فرماتے تھے کہ عوام کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے۔ شاہ بانو کیس ہو یا بابری مسجد کی شہادت کا المناک واقعہ، ایسے مواقع پر آپنے فرمایا کہ ہندوستان مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے، یہاں کے باشندوں کو اپنے پسندیدہ مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی اور اپنی زبان اور تہذیب کو فروغ دینے کے مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ فرقہ وارانہ فسادات پر آپ تڑپ اٹھتے تھے، ان فسادات کو آگ سے تعبیر کرتے تھے اور

فرماتے تھے کہ اس سے صرف ایک قوم یا طبقے کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ پورا ملک نقصان میں مبتلا ہوتا ہے۔

آپ کا خیال تھا کہ ''ہمارے ملک بلکہ تمام ممالک کے جملہ مسائل ومشکلات کا حل اسی بات میں مضمر ہے کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ مقام کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور انسان کی خدمت کے لیے اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کریں اور عصبیت خواہ کسی نوعیت کی ہو اس سے پرہیز کریں ،مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے اندر اخلاقی حس بیدار ہو اور اخلاقیات کی حکمرانی زندگی کے ہر شعبے پر قائم ہو، یہی دراصل حل ہے ان تمام مسائل ومشکلات کا جس سے آج کی انسانی سوسائٹی دوچار ہے، اسی سے دلوں کے اندر جرائم سے نفرت پیدا ہوسکتی ہے اور کرپشن (Corruption) جو تمام شعبہ ہائے زندگی کے اندر پیدا ہوگیا ہے اس کی بیخ کنی ہوسکتی ہے''۔ (۸)

تحریک کے ابتدائی دور میں بعض اہل علم ودانش کی جانب سے اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس سے وحدت ادیان کا خطرہ پیدا ہوسکتا ہے جس کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ وحدت ادیان کی نہیں یہ وحدت انسان کی دعوت ہے۔اسی طرح تقریباً چالیس سال بعد بھی یہ آرا آتی رہیں کہ ''یہ اجتماعات تعلیم یافتہ ، غیر مسلم دانشوروں ، سرکردہ سماجی ورکروں تک محدود رہنے کے باعث افادیت کے اس درجے کو نہیں پہنچ سکے جتنے عوامی اجتماعات کی شکل میں کامیابی کے امکانات پیدا کیے جاسکتے تھے.....اگر ان مخلوط اجتماعات کا پیغام صرف دانشوروں تک محدود نہ رہ کر عام ہندو سماج تک پہنچا تو یقیناً اس کے دوررس اثرات مرتب ہوتے۔(۹) کبھی یہ کہا گیا کہ ''اپنی افادیت کے باوجود مولانا کی یہ تحریک عوام الناس میں زیادہ مقبول نہ ہوسکی اور عوام اور علماء وزعماء کی اس کی طرف خاص توجہ نہ ہوسکی''۔ (۱۰)

ان افکار کے سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں (بلاتخصیص عوام وخاص) کو کسی مفید مشن یا تحریک کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔

حضرت مولاناؒ نے ملک کے طول وعرض میں متعدد اسفار اور خصوصی دورے فرمائے ،عوام سے خطابات کا سلسلہ بھی تاحیات جاری رہا، ساتھ ہی ملک کے اقتدار اعلیٰ پر فائز شخصیات کو بھی حضرت والا نے ملک کی فلاح اور خیر خواہی کی طرف متوجہ فرمایا۔وزرائے اعظم یا دیگر سیاسی قائدین نے جب بھی آپ سے ملاقات کی آپ نے انھیں مفید مشورہ دیے، نیز خطوط کے ذریعے بھی اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔

تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے، الحمدللہ یہ تحریک کسی نہ کسی درجے میں اپنا کردار نبھاتی رہی ہے، ذہنوں کو صاف کرنے اور غلط فہمیوں کے ازالے میں اس نے مؤثر اور کامیاب رول ادا کیا ہے، ملک کے مختلف حصوں میں اس کے مفید اور کامیاب پروگرام ہوتے رہے ہیں، اور ان میں شریک ہونے والوں پر اچھے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔شرکا نے واضح الفاظ میں اس کا اظہار بھی کیا ہے، بعض دفعہ حیرت انگیز اور امید افزا تاثرات سامنے آئے ہیں۔

مقام شکر و امتنان ہے کہ بانی تحریک حضرت مولاناؒ کے فیوض عام ہو رہے ہیں۔اس تحریک میں بھی تدریجاً غیبی طاقت شامل ہو رہی ہے، اس کی صدا مؤثر ہو رہی ہے، لوگوں کی توجہات بڑھ رہی ہیں، اس کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی کا اظہار ہو رہا ہے، قومی سطح کی جماعتیں اس کے مقاصد سے اتفاق کرتے ہوئے اس کام کی ضرورت و اہمیت کے اعتراف کے ساتھ تحریک کے ذمہ داران کو مدعو کر رہی ہیں اور اپنے کارکنوں کے درمیان تعارفی پروگرام منعقد کر رہی ہیں، بہ الفاظ دیگر یہ تحریک دلوں کی آواز بنتی جا رہی ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

حضرت والاؒ کی وفات کے بعد میر کارواں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ کی سرپرستی میں حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ نے اس تحریک کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں ''اور اس میں بہت سی عملی شکلیں بھی اختیار کی تھیں جن کا مختلف شہروں میں بہت گہرا اثر پڑا اور اس کے اچھے نتائج سامنے آ رہے تھے'' (۱۱) تحریک کے کاموں کی وسعت سے سبھی متعلقین خوش تھے مگر یہ خوشی اس لیے قائم نہ رہ سکی کہ استاذ محترم حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ کی طویل علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور صد افسوس کہ یہی بیماری مولانا کی مفارقت کا سبب بنی اور ہم سب کو چھوڑ کر چل بسے۔ حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی صاحبؒ کی وفات عین اس وقت ہوئی جب کہ تحریک کی عملی شکلوں کا تعارف ملکی سطح پر ہو رہا تھا، جس کے لیے مولاناؒ نے انتھک کوششیں کی تھیں، خود کو کھپا دیا تھا، بیماری کی پرواہ کیے بغیر طویل دورے کیے، ملکی سطح پر تقریباً ہر جگہ بڑی تعداد میں افراد تیار ہو رہے تھے۔ حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی صاحبؒ کی وفات کے بعد تحریک کی ذمہ داریاں حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی صاحب بخوبی انجام دے رہے ہیں، تحریک کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ ملک کے متعدد مقامات پر 'تربیتی ورکشاپ' منعقد ہو رہے ہیں، جن میں شرکت کر کے لوگ تحریک کے مقاصد، پیغام اور طریقۂ کار سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔ اور یہ سب بانی کا اخلاص اور سوز دروں کی برکتیں ہیں جو کام کو آگے لے جا رہی ہیں۔

بانی تحریک حضرت مفکر اسلام مولاناؒ کے افکار کے حامل، ان کی صحبت و تربیت یافتہ اصحاب فضل و کمال کی سرپرستی و نگرانی میں تحریک کے اثرات روز افزوں ہیں، پورے ملک میں آبادی کے اعتبار سے کہیں چند صوبوں کو ملا کر ایک اور کہیں بڑے صوبے میں چند زون بنا کر خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔ کام کو منظم اور مربوط رکھنے اور کارگزاریوں سے واقفیت کے لیے مقامی طور پر سہ ماہی اور ملکی سطح پر سالانہ مشاورتی نشست کا اہتمام بھی ہو رہا ہے۔

فی الوقت تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان لٹریچر کی تقسیم، پورے سال بالخصوص یوم جمہوریہ اور یوم آزادی کے موقع پر اسپتالوں میں مریضوں کی عیادت اور بوقت عیادت پھل اور چائے بسکٹ پیش کرنا، ہاسپٹل میں مریضوں کے لیے دوائیں مہیا کرنا، مالی کمزوری کے شکار افراد کے لیے فری میڈیکل کیمپ، ضرورت مندوں کے لیے خون عطیہ کیمپ، اسکولوں میں طلبہ کے درمیان مضمون نگاری اور تقریری مقابلہ، اولڈ ایج ہوم میں رہایش پذیر کمزوروں اور ضعیفوں سے ملاقاتیں اور ان کے

لیے دواؤں اور ضروری اشیا کی فراہمی، غربا و مساکین کی امداد وتعاون کا، کارنر میٹنگیں، گرمیوں میں ڈیوٹی پر مامور ٹریفک پولیس کے لیے ناشتہ وٹھنڈے مشروبات کا انتظام، آفات ارضی وسماوی پر متاثرین کی امداد، عوامی مقامات پر گرمیوں میں پانی کی سبیلیں، شدید سردی میں ضرورت مندوں کے لیے کمبل کی فراہمی، کیریر گائڈنس پروگرام، جیلوں میں قیدیوں کے لیے پروگرام، پسماندہ علاقوں کی کفالت، لاوارث بچوں کی کفالت، ڈائیلاگ، اجلاس عام وغیرہ پر مشتمل متنوع پروگراموں کے ذریعے الحمدللہ تحریک پورے ملک میں اپنی کارگردگی پیش کررہی ہے۔ جس کے اچھے اثرات دیکھنے میں آرہے ہیں۔

خوش آئندہ بات یہ ہے کہ اسپتالوں میں مریضوں کی عیادت ہو یا پانی کی سبیلیں، خون کا عطیہ کیمپ ہو یا چھوٹے بڑے اجلاس، ان پروگراموں میں برادران وطن کی نہ صرف شرکت ہورہی ہے بلکہ ان کی جانب سے تعاون کی شکلیں بھی سامنے آرہی ہیں۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(۱) انسانیت کی مسیحائی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، ص ۳۳۵، ناشر سید احمد شہید اکیڈمی تکیہ کلاں رائے بریلی، سنہ اشاعت اپریل ۲۰۱۴ء

(۲) تحفہ دین و دانش، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، ص ۸۴، ۸۵ ناشر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، طبع اول ۱۹۸۷ء

(۳) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ دعوت وفکر کے اہم پہلو، مولانا سید بلال حسنی ندوی، ص ۲۲۱، ناشر سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی، طبع اول ۲۰۰۰ء

(۴) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو، ص ناشر دفتر کل ہند تحریک پیام انسانیت لکھنؤ،

(۵) تذکرہ مفکر اسلام، حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ، ص ۱۲۵، ناشر سید احمد شہید اکیڈمی تکیہ کلاں رائے بریلی، سنہ اشاعت فروری ۲۰۱۵ء

(۶) تحفۂ انسانیت، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، ص ۲، ناشر مکتبہ عثمانیہ رائے بریلی، مطبع نظامی پریس لکھنؤ

(۷) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور عصری مسائل، مولانا سید واضح رشید ندوی، تعمیر حیات لکھنؤ، ص ۸۸، ۸۹، مفکر اسلام نمبر جولائی تا اگست ۲۰۰۰ء

(۸) اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، ص ۲۲۸، ۲۲۹، ناشر جمعیۃ الہلال الاحمر الخیریۃ مظفر پور، سنہ اشاعت ۲۰۱۰ء

(۹) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ افکار و آثار، مولانا عبید اقبال عاصم، ص ۳۲۸، ۳۲۹، ناشر الہدایۃ ریسرچ سینٹر جے پور، سنہ اشاعت جولائی ۲۰۰۰ء

(۱۰) تحریک پیام انسانیت، مولانا احسن علی خاں ندوی، ص ۱۴۸، سہ ماہی کاروان ادب لکھنؤ، اشاعت اپریل تا مارچ ۲۰۰۰ء

(۱۱) تحریک پیام انسانیت اہمیت وضرورت افادیت ص ۱۵، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی، ناشر سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی، سنہ اشاعت مئی ۲۰۱۶ء

برصغیر میں
حضرت مولانا کا قائدانہ کردار

(مفتی) محمد سعید اسعد قاسمی
دارالقضا امارت شرعیہ، آسنسول

۱۹۱۴ء میں آسمان کے ایک افق پر ایک آفتاب کے غروب ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے افق پر دوسرا سورج بھی نمودار ہوا۔ یعنی ادھر علامہ شبلی نعمانیؒ آسودۂ خاک ہوئے اور ادھر رائے بریلی میں خانوادۂ عز وشرف ونبوت میں ایک ستارہ جگمگا اٹھا۔ یعنی رائے بریلی نے ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کو جنم دیا، جس نے خاندانی روایات اور تحریک ندوۃ العلما کے چشمۂ حیواں سے آب زلال لیا اور وقت کے بڑے بڑے مشائخ اور اصحاب علم وفضل علامہ سید سلیمان ندویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا علی احمد لاہوری وغیرہم سے کسب فیض کیا اور کچھ ہی دنوں میں اخلاص و استغنا اور احسان وسلوک کا آفتاب بن گیا۔ جس نے ملک ملک، شہر شہر اور چپہ چپہ کی خاک چھانی اور دعوتی، اصلاحی اور فکری انوار سے منور کر دیا۔ جس نے اپنی انقلاب انگیز اور روح پرور تحریروں سے اس کارگہہ عالم میں ہلچل پیدا کر دی۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ جن گوناگوں صفات کے حامل تھے، ان پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ لکھتے ہیں:

> ”میں جب اسلامی فکر کی قوس وقزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر واسلوب ایک گلدستہ معلوم ہوتا ہے، جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے، ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز وگداز، مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا محمد الیاس، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری اور حضرت مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے، علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے مناقض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے، جسے ناقدین علم وفن نے نظر انداز کر دیا ہے۔“

دعوت کے کام میں مولاناؒ نے کیا کارنامہ انجام دیا اور اس سلسلے میں ان کا طریقۂ کار کیا تھا؟ یہ ایک الگ موضوع ہے، جس پر روشنی ڈالنا میرا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ میرا مطلوب یہ ہے کہ برصغیر بالخصوص ہندو پاک میں آپ نے اس کے لیے کس طرح کی کوششیں کیں؟ ذیل کے مضمون میں اختصار کے ساتھ اسی کو واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہندوستان کو لیتے ہیں، یہ ان کا اپنا ملک تھا، اس کی آزادی کے لیے اجداد نے بے مثال قربانی دی تھی، اس کے باوجود یہاں کے مسلمانوں کا غیر محفوظ اور دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنا اور آزادی کی مشترکہ جدو جہد کرنے والے ہندو اور مسلمانوں میں ٹکراؤ کی کیفیت سے آپ کا دل بہت دکھتا تھا، اس لیے آپ نے ہندوستانی سماج کی اعلیٰ انسانی قدروں کے مطابق تشکیل کی کوشش کی، اور ابنائے وطن کے مابین ہمدردی و رواداری اور اخوت اور بھائی چارگی قائم کرنے اور خاص کر مسلمانوں کو علمی اور اخلاقی بلندیوں پر پہنچانے کے لیے مختلف گوشوں سے خدمات انجام دیں۔

حضرت مولانا نے دیگر ممالک کی طرح یہاں بھی سیاست میں علمی حصہ لینے کے بجائے قائدین کی رہنمائی اور امت کی رہبری کا طریقہ اختیار کیا اور ان میں سیاسی شعور، خود اعتمادی اور ایک باعزت شہری بن کر رہنے کا حوصلہ پیدا کیا اور جن قائدین کی طرف سے خامی محسوس ہوئی بلاخوف وخطر ان خامیوں کی نشان دہی فرمائی اور خطرات سے آگاہ کیا، چنانچہ اندرا گاندھی کی طرف سے جب مسلمانوں کے ساتھ غیر مناسب رویہ سامنے آیا تو حضرت مولانا نے ان کو نصیحت کی کہ عوام کے ساتھ سختی کے بجائے نرمی اور محبت کا طریقہ اختیار کریں ورنہ سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے اور جب وہ مولانا کی پیش گوئی کے مطابق الیکشن ہار گئی اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ ہاتھ سے چھن گیا تو افسوس اور ندامت کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس وقت بھی مولانا نے توجہ دلائی کہ ہندوستانی قیادت میں سب کے ساتھ منصفانہ سلوک اختیار کرنے کو اپنا شیوا بنائیں۔

بابری مسجد کے مسئلے میں حضرت مولانا نے اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ملاقات کی اور حکومت سے اس سلسلے میں صحیح رویہ اپنانے اور سرد مہری سے باز آنے کی تلقین کی، پھر مولانا عبد الکریم پاریکھ سمیت، بہار کے گورنر یونس سلیم صاحب اور آندھرا پردیش کے گورنر کرشن کانت جی (جو بعد میں نائب صدر جمہوریہ بھی بنے) کی تجویز کے مطابق مدراس کے شنکر آچاریہ سے ملاقات کی اور تجویز آئی کہ مسلمانوں کے ساتھ بعض ہندو شخصیتوں کو ملا کر ایک کمیٹی تشکیل دی جائے، تاکہ مسجد کی بازیابی کی کوشش میں ہندو مسلم منافرت اور فسادات کا اندیشہ نہ رہے، اس کو دانشوروں نے مولانا کی ''پختہ کوشش'' قرار دیا، لیکن اس سے بظاہر مسلم جماعتوں میں انتشار کا اندیشہ تھا، جس کی وجہ سے مولانا نے اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا۔

بھاگلپور فساد کے بعد جب کانگریس کو شرمناک شکست ہوئی اور راجیو گاندھی کی جگہ وی پی سنگھ وزیر اعظم بنے تو حضرت مولانا نے طویل خط لکھ کر آگاہ کیا کہ کوئی بھی پارٹی اپنی خامیوں کی وجہ سے شکست کھاتی ہے اور کامیاب ہونے والی

پارٹی کو یہ موقعہ رہتا ہے کہ وہ ان خامیوں کو دہرانے سے گریز کرے اور اپنے کو مفید ثابت کرے، ورنہ شکست خوردہ پارٹی اپنی خامیوں کو دور کر کے کامیاب ہوسکتی ہے اور نئی برسر اقتدار پارٹی اپنی خامیوں کی وجہ سے شکست و ہزیمت کا شکار ہوسکتی ہے، نیز اس حقیقت کا بھی استحضار رہنا چاہئے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والی ہستی کو سب سے زیادہ ظلم، سفاکی اور ناانصافی پسند ہے اور ملک وقوم کے بقاوفنا اور عروج وزوال کے سلسلے میں یہی چیز 'فیصلہ کن' ثابت ہوسکتی ہے۔

حضرت مولانا نے وزرائے اعظم نرسمہاراؤ اور اٹل بہاری واجپئی کو بھی سمجھایا کہ اقتدار کی ہوس میں اخلاقی قدریں پامال ہورہی ہیں، آپ کی ذمہ داری ہے کہ ملک کو اس خطرے سے بچائیں، اس طرح ملک کے بہت سے مسائل میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے آپ نے حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کی فہمائش کی، شاہ بانو کیس میں بعض نمائندوں کے ذریعے راجیو گاندھی سے ملاقات کروائی، جس کے نتیجے میں مسلم ومن پروٹیکشن ایکٹ (MUSLIM WOMEN PROTECTION ACT) منظور ہوا، اسی طرح جب ہندوستان میں ''وندے ماترم'' کے قضیہ کو دوبارہ مہمیز لگایا گیا تو صرف ان کی ایک پرجلال آواز نے اس شرانگیز فتنہ کو زمیں دوز کردیا۔ انھوں نے کہا: ''حکومت کی تعلیمی پالیسی ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے اور اس پوری جدوجہد سے کوئی ادنیٰ فائدہ ہونے والا نہیں ..... اس وقت حکومت تعلیم کی راہ سے جو کچھ کرنا چاہتی ہے اور جس طرح کا نصاب ونظام مرتب کیا گیا ہے، وہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے سنگین اور خطرناک ہے ..... مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اہمیت ان کے عقیدۂ توحید کی ہے اور وہ اس کی حفاظت ایمان کی شرط سمجھتے ہیں ..... ہماری مخالفت صرف عقیدے کی بنیاد پر ہے۔ یہ خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے اور حکومت جس طرح اسکولوں میں اسے نافذ کرنا چاہتی ہے، وہ میرے نزدیک مداخلت فی الدین ہے''، نیز آپ نے اپنے صحافتی بیان میں فرمایا: ''پھر تو مسلمانوں کو مشورہ دینا ہوگا کہ وہ بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹالیں''، جس کی وجہ سے وندے ماترم کی تجویز مسلمانوں کے حق میں منسوخ کی گئی، ۱۹۶۳ء میں جب مشرقی ہندوستان میں فسادات کا سلسلہ چلا اور مسلمانوں میں بے اعتمادی اور کم ہمتی پیدا ہوئی تو ملک کی متعدد شخصیتوں کے اجتماع اور مشوروں سے ''مجلس مشاورت'' قائم کی، ملک سے ہندو مسلم ٹکراؤ ختم کرنے کے لیے اور آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کے لیے ''پیام انسانیت'' کا آغاز کیا، جس نے ہندو مسلم منافرت کو کم کرنے کی کوشش کے لیے مختلف جگہوں پر کامیاب اجلاس منعقد کیے اور الحمدللہ پیام انسانیت کا یہ کام نہایت منظم انداز میں اب بھی جارہی ہے۔

پاکستان کا قیام اسلامی احکام کے نفاذ کے مقصد سے ہوا تھا، حضرت مولانا نے اس سے قطع نظر کہ یہ تقسیم صحیح تھی یا غلط، وہاں ہونے والی نفاذ اسلام کی کوشش کو ہمیشہ سراہا، چنانچہ پاکستانی صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صدر شہید کی میرے دل میں کتنی قدر ومنزلت

ہے اور اسلامی نظام حکومت کے اجرا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور اسلامی قوانین کو نافذ کرنے اور ملک کے امن وامان اور عزت ووقار کی پاسداری کے لیے ان کی صدارت وقیادت کے مرکزی عہدے پر باقی رہنے کو میں ضروری سمجھتا ہوں''، آپ نے اس سلسلے میں جنرل صاحب کو خطوط بھی لکھے؛ چنانچہ ایک خط کے جواب میں جنرل صاحب لکھتے ہیں: پاکستان میں نفاذ اسلام کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں ، ہماری کوشش ہے کہ ہم نظام اسلام کو جلد از جلد زندگی کے شعبوں میں نافذ کریں ، کیوں کہ اسلام کو عملی زندگی میں اپنانا ہمارا صرف دینی تقاضا ہی نہیں ، بلکہ ہمارے ملک کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔

پاکستان کے علاوہ آپ نے بنگلہ دیش، برما اور سری لنکا کے قائدین علماء و دانشوران سے بھی خطاب کیا ، چنانچہ بنگلہ دیش کے ایک سفر میں آپ نے اہل حکومت اور علما کو متوجہ کیا کہ اس ملک کی سلامتی ،خوش حالی اور عزت ، اسلام سے وابستہ ہے اور علماء کو چاہئے کہ بنگالی زبان میں مہارت پیدا کرکے اس میں قیادت کا درجہ حاصل کریں ۔ برما کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے ان پر آنے والے خطرات سے پہلے ہی آگاہ کیا تھا کہ یہاں کا اس قدر تعصب اور اس کے ساتھ مذہب بیزاری، فرمان الٰہی: ﴿ إني أراكم بخير وإني أخاف عليكم عذاب يوم محيط ﴾ (ھود:۸۴) کا ڈر پیدا کر رہا ہے کہ اس طرح دولت کے نشے میں مست ہو کر احکام الٰہی سے روگردانی عذاب الٰہی کا سبب نہ بن جائے ، چنانچہ کچھ دنوں بعد ہی وہاں کمیونسٹ انقلاب آیا ، جس کی وجہ سے اہل ثروت نقل مکانی پر مجبور ہو گئے اور حال میں وہاں دل دہلا دینے والی خوں ریزی بھی کسی نہ کسی درجے میں اپنی غفلت ہی کا نتیجہ تھی۔

حضرت مولانا کا سری لنکا کا بھی سفر ہوا اور وہاں کے قائدین کو لطیف پیرائے میں اس بات کی طرف ابھارا کہ اس سرزمین کے سلسلے میں روایت مشہور ہے کہ آدم علیہ السلام یہیں نازل ہوئے ، جو انسانوں کو احساس دلاتی ہے کہ تم سب ایک آدم کی اولاد اور بھائی بھائی ہو ، اس لیے اخوت و بھائی چارہ کا اعلان اگر دوسرے ممالک والے ایک بار کریں تو آپ کو دس مرتبہ اس کا اعلان کرنا چاہئے۔

یہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے برصغیر میں قائدانہ کردار کی ایک مختصر جھلک تھی ، جس سے ہمیں بہت سارے اسباق (بالخصوص موجودہ حالات میں) ملتے ہیں ، ہمیں ان اسباق کو نہ صرف یہ کہ سیکھنے کی ضرورت ہے؛ بلکہ روبہ عمل لاکر قائدانہ کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے ؛ تاکہ ہمارے ملک کے ساتھ ساتھ قرب وجوار کے ممالک میں بھی امن وآشتی اور سلامتی کا راج قائم ہو جائے ، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ، آمین!

☆☆☆☆☆☆☆☆

(افسانہ)

بھول

سید عون الحسن غازی، لاہور

میں اپنے مکان کے باہر کرسی ڈالے بڑے مزے سے بیٹھا گلی کے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا..... اچانک میری نظر چچا رحمت علی پر پڑی جو تیز تیز قدم اٹھاتا مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے پوچھوں..... کیا بات ہے..... مگر اتنی دیر میں وہ مجھ سے کافی دور جا چکا تھا۔

میں پھر ان بچوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد چچا رحمت دوبارہ اسی تیزی کے ساتھ آتا دکھائی دیا..... جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے جلدی سے پوچھا'

''چچا رحمت! کیا بات ہے؟ آج بڑے پریشان لگ رہے ہو' گھر میں خیریت ہے نا!''

''اعجاز میاں! کیا بتاؤں' ظفر آج پھر لاپتہ ہے'' اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا' پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ''صبح سے گھر سے نکلا ہوا ہے' اب بھی اسی کو تلاش کرنے نکلا تھا مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔''

''چچا وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ کہیں گیا ہوگا' آجائے گا تھوڑی دیر میں'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اصل میں بات یہ ہے اعجاز میاں' صبح دکان پر جانے سے پہلے میں نے اسے بہت پیٹا تھا..... پھر میں دکان پر چلا گیا..... اس کی ماں سے کہہ گیا تھا کہ سودا منگوا کر اسے دکان پر بھیج دے۔ دوپہر تک جب وہ دکان پر نہ پہنچا تو میں گھر میں اس کا پتہ کرنے آیا۔ اس کی ماں نے بتایا کہ وہ تو اسی وقت تمھارے پیچھے ہی چلا گیا تھا۔ اب میں اس کے سارے دوستوں سے بھی پوچھ چکا ہوں' جہاں جہاں وہ جا سکتا ہے' وہاں سے بھی ہو آیا ہوں مگر اس کا کہیں پتہ نہیں چل رہا۔''

''چچا وہ ایک دفعہ پہلے بھی گھر سے بھاگ گیا تھا اور اپنی خالہ کے پاس شاید پتوکی چلا گیا تھا۔ تم نے وہاں سے پتہ کیا۔'' میں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے وہاں بھی فون کر کے پتہ کر لیا ہے مگر وہ وہاں بھی نہیں پہنچا۔'' چچا رحمت نے جواب دیا۔

وہ میرے پاس کافی دیر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر چل دیا۔

چچا رحمت اسی گلی میں ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر ہی رہتا تھا۔ بازار میں اس کی لوہے کے دروازے اور

کھڑکیاں بنانے کی دکان تھی۔ظفر تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا ۔پرائمری کے بعد تین سال سے باپ کے ساتھ دکان پر کام کررہا تھا۔ محلے کے کافی لوگوں سے اس کے کام کی تعریف بھی سن چکا تھا۔ جہاں سارے محلے والے چچا رحمت کی عزت کرتے وہاں اس بات سے نالاں بھی رہتے کہ وہ اپنے بیٹے کو بڑی بے دردی سے مارتا تھا۔ چاہے کوئی بات ہو یا نہ بھی ہو وہ دن میں ایک آدھ بار ظفر کی پٹائی ضرور کرتا تھا۔

اگلے دن چچا رحمت کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ظفر کا پتہ کرتا چلوں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا ''ابھی تک اس کا کچھ پتہ نہیں چلا''۔ اگلے تین چار دن' میں خاصا مصروف رہا۔ظفر کا پتہ نہ کرسکا ۔ جمعے کے روز شام کے وقت گلی میں کھڑا تھا کہ چچا رحمت آگیا۔آتے ہی بولا ''اعجاز میاں! جلدی سے میرے ساتھ تھانے چلو۔''

''کیا بات ہے چچا' خیر تو ہے'' میں نے اسے اتنی جلدی میں دیکھ کر پوچھا۔

''بیٹا ابھی ابھی ایک ملنے والے نے بتایا ہے کہ ظفر کو تھانے میں جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے'' چچا رحمت میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے دوبارہ کہنے لگا ''بیٹا مجھے پتہ ہے کہ تھانے کا ایس ایچ او تمھارا واقف کار ہے' اسی لیے میں تمھارے پاس آیا ہوں کہ ظفر کو وہاں سے لانے میں کوئی مشکل نہ ہو'' ..... چچا رحمت کی بے چینی دیکھتے ہوئے میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

تھانے دار نے ہمیں بتایا کہ انھوں نے ان پانچ دنوں میں اس عمر کے کسی لڑکے کو پکڑا ہی نہیں۔ اگر آوارہ گردی یا کسی اور جرم میں کسی لڑکے کو پکڑتے تو سب سے پہلے اس کے گھر والوں کو اطلاع کرتے۔ واپسی پر چچا سارے رستے روتا رہا۔ وہ مجھ سے بار بار کہتا..... ''اگر ظفر مجھے مل جائے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ اسے کبھی نہیں ماروں گا۔ وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد اللہ نے ہمیں دیا ہے۔''

میں انھیں تسلی دیتا رہا ''خدا کے فضل سے ظفر ضرور مل جائے گا۔آپ پریشان نہ ہوں۔''

اس دن میں اسلم سے ملنے اس کی دکان پر گیا۔اسلم میرا بہت اچھا دوست تھا۔اس کی دکان اندرونِ شہر میں تھی اور میں کبھی کبھی فارغ وقت میں اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ کچھ دیر تک ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ کہنے لگا ''تیرے لیے چائے منگواؤں یا بوتل؟''

''چائے ٹھیک رہے گی'' میں نے جواب دیا اور کاؤنٹر پر پڑے اخبار کو اٹھا کر دیکھنے لگا..... کچھ دیر بعد وہ کسی کو چائے لانے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک سولہ سترہ برس کا لڑکا چائے کے برتن اٹھائے دکان کے سامنے کھڑا تھا۔

''اوہ..... یہ تو ظفر ہے..... چچا رحمت کا لڑکا۔'' میں نے بڑی آہستگی سے خود کلامی کے انداز میں کہا..... اسلم نے شاید میری بات سن لی تھی۔اس نے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' تم یہ کس سے محوِ کلام ہو؟''

''کچھ نہیں!''..... میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چچا رحمت کے لڑکے نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگ اٹھتا' میں جلدی سے اس کے

پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے اسے ساتھ والے سٹول پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ ڈرتے ڈرتے سٹول پر بیٹھ گیا۔

''ظفر! تمھیں شرم آنی چاہئے۔ گھر والوں کو اس طرح پریشان کر کے تمھیں کیا ملا۔ تمھارے ابا نے تمھیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ تمھاری والدہ اور بہنیں بے چاری الگ پریشان ہیں۔ اب تم کوئی بچے تو نہیں جو ایسی حرکتیں کرتے پھرو'' میں نے اسے نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہی تو بات ہے اعجاز بھائی! کہ میں اب بڑا ہو چکا ہوں۔ سمجھ بھی رکھتا ہوں مگر یہ بات میرے ابا نہیں سمجھتے۔ وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مارنا شروع کر دیتے ہیں۔''

''تمھیں اپنی ماں اور بہنوں کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ ان پر کیا گزرتی ہوگی۔''

اسلم ہمیں بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسلم سے اجازت لی اور اٹھ کھڑا ہوا اور ظفر کو بھی چلنے کے لیے کہا۔

''نہیں اعجاز بھائی! میں گھر نہیں جاؤں گا'' اس کا جواب سن کر مجھے انتہائی کوفت ہوئی۔ اتنی دیر سے اس کے ساتھ مغز ماری کر رہا ہوں مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا..... اب میں نے سخت لہجے میں کہا'' تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا ورنہ میں ابھی پولیس والوں کو بلاتا ہوں۔ وہ تمھیں خود تمھارے والدین کے پاس پہنچا دیں گے۔ مگر اس سے پہلے وہ تمھاری پٹائی بھی کریں گے۔''

پولیس اور پٹائی کا سن کر وہ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسلم کو مختصر میں نے ساری بات سمجھا دی تھی اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جہاں ظفر کام کر رہا ہے' وہاں بتا دے کہ اسے اس کے گھر والے لے گئے ہیں۔

جب ہم گھر پہنچے تو چچا رحمت گھر پر ہی تھا۔ ظفر کو دیکھتے ہی اس کی وہ پرانی عادت عود کر آئی اور بلا سوچے سمجھے ظفر کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چھوڑو اعجاز میاں! میں اس کی ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔ میں اس کے لیے کہاں کہاں ذلیل و خوار نہیں ہوا ..... میں اس کا خون پی جاؤں گا۔'' چچا رحمت آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''چچا رحمت! تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب ظفر مل جائے تو اسے کبھی نہیں ماروں گا' اور اب تم نے آتے ہی مارنا شروع کر دیا''..... میں نے ظفر کو اشارہ کیا کہ وہ گھر کے اندر چلا جائے۔ ظفر اندر چلا گیا۔ میں نے چچا رحمت کی بیوی سے کہا'

''آپ ظفر کا خیال رکھیں' چچا رحمت ابھی آتے ہیں۔'' پھر میں نے چچا رحمت کو ساتھ لیا اور اپنے گھر لے آیا۔

گھر کی بیٹھک میں بٹھا کر میں تقریباً ایک گھنٹے تک اسے سمجھاتا رہا۔ جانے سے پہلے میں نے اسے پھر کہا'' چچا اب اسے جا کر کچھ نہ کہنا بلکہ اسے محبت سے سمجھانا۔ چچا یہ سب کچھ اسی کا تو ہے۔ ابھی سے اس پر ذمہ داری ڈالو گے تو اسے احساس ہوگا۔ اسے پتہ چلے گا کہ اس کے گھر تین جوان بہنیں بیٹھی ہیں اور جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ اب اسی نے گھر کا سب بوجھ اٹھانا ہے تو وہ ایسی حرکتیں کبھی نہیں کرے گا۔ زندگی کا

کیا پتہ چچا' اسے ابھی سے اس قابل بنادو کہ تمھارے بعد اسے کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ اس پر اعتبار کرو.....''

چچا رحمت نے میری طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا'' ٹھیک ہے اعجاز میاں! جیسا تم کہتے ہو' ویسا ہی ہوگا۔''

تیسرے دن میں چچا رحمت کی دکان کے آگے سے گزر رہا تھا۔ میں نے سرسری نظر سے دیکھا۔ چچا رحمت دکان میں بیٹھا غالباً کچھ حساب کتاب میں مصروف تھا۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ مگر چچا رحمت نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا' پیچھے سے آواز دی'

''اعجاز میاں!.....'' میں رک گیا۔ گھوم کر دیکھا تو وہ میری طرف آرہا تھا۔

''کیا حال چال ہیں چچا رحمت؟''

''اعجاز میاں! ظفر پھر گھر سے بھاگ گیا ہے'' چچا رحمت روہانسی آواز میں بولا۔

''ہوں.....مگر اب کیوں؟''

''بس مجھ سے بھول ہوگئی۔ تمھارے گھر سے لوٹنے کے بعد میں جب اپنے گھر آیا تو وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ میرا دیکھتے ہی خون کھول گیا۔ مجھے یکلخت خیال آیا کہ کام کا نہ کاج کا' دشمن اناج کا' بس جوتا اتار لیا اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ جب کچھ غصہ نرم پڑا تو اسے سمجھانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ سمجھ جائے گا.....اگلے دن صبح میں اسے دکان پر ساتھ لے آیا۔ دس بجے کے قریب میں نے اسے بازار میں چائے لانے کے لیے بھیجا۔ بہت دیر گزرنے کے بعد جب وہ واپس نہ آیا تو میں خود اٹھ کر چائے والے کے پاس پہنچا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس کے پاس آیا ہی نہیں۔ دکان بند کر کے گھر پہنچا وہاں بھی یہی جواب ملا.....اب تک کئی جگہوں سے معلوم کر چکا ہوں' یہی جواب ملتا ہے۔ کل سے اس کی ماں رو رو کر نڈھال ہو چکی ہے۔ بہنوں کا رونا بھی بند ہونے میں نہیں آرہا .....اب اگر وہ گھر واپس آجائے تو میں اسے کبھی نہیں ماروں گا ..... بالکل نہیں ماروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے چچا رحمت خود بھی رونے لگا۔

میں نے چچا رحمت کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھی۔

غزل

حفیظ الرحمٰن احسنؔ

ہے چراغِ آرزو تابندہ تر ' چلتے چلو
آج بھی جاری ہے خوشبو کا سفر' چلتے چلو

آشکارا ہیں سب اس پر جستجو کے مرحلے
راہبر روشن نظر ہے ' بے خطر چلتے چلو

آج بھی ہر سمت روشن ہیں امنگوں کے چراغ
کہہ رہی ہے کوئی چشمِ معتبر' چلتے چلو

ہوش کا دامن نہ چھوٹے ' وا رَہے چشمِ شعور
راستوں کے پیچ و خم سے باخبر چلتے چلو

شر کی پستی سے ابھرکر خیر کی رفعت ملے
تا فرازِ امتیازِ خیر و شر چلتے چلو

کس طرح آسان ہوجاتا ہے ایک اک مرحلہ
اے خوشا یہ عزم و ہمت کا ثمر' چلتے چلو

گوہرِ مقصود بن جائے نہ دنیا کی فلاح
منزلِ عقبیٰ رہے پیشِ نظر ' چلتے چلو

راہِ دینِ مصطفیٰ ہے ضامنِ منزل تو پھر
بالیقیں آئے گا خوشیوں کا نگر ' چلتے چلو

ہم عناں احسنؔ رہیں ہر گام تازہ ولولے
عزمِ راسخ کا لیے رختِ سفر ' چلتے چلو

غزل

حفیظ الرحمٰن احسن

چراغِ علم و بصیرت جو دسترس میں رہے
تو کائنات کی ہر شے ہمارے بس میں رہے

رہے نظر کو تلاشِ حقیقتِ اشیا
وفورِ شوق کی گرمی نفس نفس میں رہے

جنوں کے ہاتھ میں دے کر عناں تجسس کی
خرد سے ہاتھ اٹھاؤ جو پیش و پس میں رہے

رہے گا گرمِ سفر کاروانِ شوق ترا
خیال تیرا اگر دعوتِ جرس میں رہے

رہے گا نغمہ سرا، ہے جو فطرۃً آزاد
بسے وہ صحنِ گلستاں میں یا قفس میں رہے

ردائے حسنِ عمل ہوسکی نہ جن کو نصیب
لباسِ عیش میں، یا جامۂ ہوس میں رہے

چھپائے جام وہی، رس کے، سینۂ گل میں
جو بن کے رازِ نہاں فطرتِ مگس میں رہے

جو پھول ہے تو وہ بانٹے گا نکہتیں احسن

ستارے جس کی گردِ راہ تھے وہ کارواں تم تھے

(مرثیۂ وفات حسرت آیات مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

محمد نعمان اکرمی جامعی ندوی

تمھیں فخرِ وطن لکھیں، یا ہم فخرِ جہاں لکھیں
تمھیں آوازِ حق لکھیں، یا پھر حق کی زباں لکھیں
تمھیں فکر و نظر کا ایک بحرِ بے کراں لکھیں
ادیبِ بے بدل لکھیں، خطیبِ خوش ادا لکھیں
نوائے وقت لکھیں، وقت کا مردِ با صفا لکھیں
تمھیں اے فلسفی علامۂ عصرِ رواں لکھیں
لکھیں گلزارِ امت کے گلِ عنبر فشاں تم تھے
لکھیں نباضِ دوراں تم تھے، میرِ جانِ جاں تم تھے
تمھیں ہم عظمتِ ہندوستاں کا پاسباں لکھیں
تیری ہستی وقارِ ملک و ملت کی نشانی تھی
ہویدا تیری سیرت سے نبی کی زندگانی تھی
تمھیں یادِ سلف اور راستی کا ترجماں لکھیں
نقیبِ امنِ عالم تھے، محبت کی محبت سے
پیام امن انسانیت کا دیدیا انساں کو حکمت سے
تمھیں رمزِ محبت، آدمیت کا نشاں لکھیں
بہت سونی ہے مسلم پرسنل لا بورڈ کی محفل
ترا دانش کدہ ندوہ تھا، تو اس کا تھا ایک فاضل
تمھیں اے بوالحسن! ہم کشورِ اہلِ قلم کا حکمراں لکھیں
فلک پر تیری آمد سے ملائک جشن کرتے ہیں
عقیدت مند اظہارِ عقیدت ایسے کرتے ہیں
تیری رحلت سے ہے سارا جہاں ماتم کناں لکھیں

تمھیں فخرِ زمیں لکھیں، یا فخرِ آسماں لکھیں
تمھیں ہم ملتِ اسلام کے روحِ رواں لکھیں
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں
مفسر، مجتہد لکھیں، مورخ با خدا لکھیں
شناسائے مزاجِ دہر لکھیں، مقتدا لکھیں
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں
لکھیں ہر محفلِ علم و عمل کی جانِ جاں تم تھے
لکھیں مہرِ درخشاں تم تھے، نورِ قدسیاں تم تھے
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں
لہو میں حضرتِ حسنین کے خوں کی روانی تھی
نگاہ و نطق سے دینِ مبیں کی ترجمانی تھی
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں
سفیرِ ی تھے، انس رکھا مہر و الفت سے
دلوں پر چھاگئے سب اہلِ دل کے حسنِ سیرت سے
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں
پیامِ حلقۂ انسانیت پر آپڑی مشکل
وجودِ حضرتِ والا سے تھا سہما ہوا باطل
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں
تیری پاکیزگی موت پر سب رشک کرتے ہیں
تیری خاطر دعائے مغفرت ہر لمحہ کرتے ہیں
تمھیں اے بوالحسن! ہم مومنِ شیریں زباں لکھیں